(Posted on March 31, 2009)

امریکی محکمہ خارجہ

ادارہ برائے جمہوریت، انسانی حقوق ومحنت

2008 کی انسانی حقوق کی رپورٹ

25فروری2009

پاکستان

پاکستان ایک وفاقی جمہوریہ ہے۔اس کی آبادی تقریباً173 ملین ہے۔2008 میں پاکستان میں سول جمہوری حکمرانی بحال ہوئی۔ پاکستان پیپلز پارٹی کی مقتول لیڈر بینظیر بھٹو کے شوہر آصف علی زرداری 6 ستمبر کو سربراہ ریاست مقرر ہوئے۔انھوں نے سابق صدر پرویز مشرف کی جگہ یہ عہدہ سنبھالا، جو 18 اگست کو مستعفی ہوگئے تھے۔ بین الاقوامی مبصرین کا کہنا ہے کہ 18 فروری کو پاکستان میں جو الیکشن ہوئے، اگرچہ ان میں بے ضابطگیاں کی گئیں، تاہم ان میں مسابقت دیکھنے میں آئی اور اس سے عوام کی خواہشات کی عکاسی ہوئی۔الیکشن کے نتیجہ میں سابق اپوزیشن پارٹیاں، پیپلز پارٹی کی قیادت میں برسراقتدار آئیں اور انھوں نے مخلوط حکومت قائم کی۔ پارلیمنٹ نے یوسف رضا گیلانی کو 24 مارچ کو وزیراعظم اور سربراہ حکومت منتخب کیا۔ سال کے اختتام تک پیپلز پارٹی اور اس کی اتحادی جماعتوں کو قومی حکومت کی انتظامی اور مقنّنہ شاخوں اور چار میں سے تین صوبائی اسمبلیوں پر کنٹرول حاصل تھا۔سپریم کورٹ کے جن 13 ججوں کو صدر اور آرمی چیف مشرف نے نومبر 2007 میں برطرف کر دیا تھا، نئی حکومت نے ان میں سے 5 ججوں کو نئے حلف کے تحت دوبارہ مقرر کر دیا، تین جج ریٹائر ہوگئے یا انھوں نے استعفیٰ دے دیا جبکہ 5 جج، جن میں چیف جسٹس افتخار چوہدری بھی شامل تھے، غیر فعال رہے۔نئی منتخب حکومت نے اُن پابندیوں پر عمل نہیں کیا، جو 2007 کی ہنگامی حالت کے دوران میڈیا پر عائد کی گئی تھیں۔حکومت نے مشرف دور میں یونینوں پر عائد کردہ پابندیاں بھی اٹھالیں اور اس طرح سال کے اختتام تک بعض صنعتوں کے مزدوروں نے اپنے آپ کو قانون کے مطابق منظّم کیا۔بلوچستان میں شورش ختم کرنے کی غرض سے حکومت نے بعض بلوچ لیڈروں کے خلاف سیاسی بنیادوں پر قائم مقدمات اور ان کے بیرون ملک جانے پر عائد پابندیاں ختم کر دیں۔زیرنظر سال کے دوران سیکورٹی فورسز نے بالعموم سویلین حکام کی ہدایات پر عمل کیا، تاہم بعض صورتوں میں سیکورٹی فورسز کے عہدیداروں نے من مانی کارروائیاں بھی کیں۔آرمی چیف نے 3,000 فوجی افسروں کو سول محکموں سے واپس بلالیا، جہاں سابق صدر مشرف نے انھیں تعینات کیا تھا۔

2007 کے اختتام پر ہنگامی حالت کے خاتمے کے بعد 2008 میں انسانی حقوق کی صورتحال میں قدرے بہتری آئی، لیکن بالعموم یہ صورتحال خراب رہی۔اس سلسلے میں جو بڑے بڑے مسائل دیکھنے میں آئے، ان میں ماورائے عدالت ہلاکتیں، ایذارسانی اور لوگوں کا لاپتہ ہوجانا شامل ہے۔ایسے واقعات بھی ہوئے کہ مقامی پولیس نے سرکاری اختیارات سے تجاوز کیا۔وفاق کے زیرانتظام قبائلی علاقوں (فاٹا) میں اجتماعی سزا دینے کا مسئلہ موجود رہا، جہاں فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن (ایف سی آر) کے قوانین نافذ ہیں۔اختیارات کا غلط استعمال کرنے والوں کے خلاف کارروائی میں غیرضروری طوالت، تاخیر اور ان کے خلاف انضباطی اور قانونی کارروائی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی دیدہ دلیری بڑھتی گئی۔جیلوں کے ناقص حالات، لوگوں کی من مانی گرفتاریاں اور مقدمہ چلانے سے پہلے طویل عرصہ تک ملزمان کو زیرحراست رکھنے کے مسائل بھی موجود رہے۔عدلیہ کی آزادی بھی محدود رہی۔پولیس اور دوسرے سرکاری اداروں میں کرپشن عام رہی اور حکومت نے اس مسئلہ پر قابو پانے کے لئے کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی۔2006 کے تحفظ نسواں قانون

(Posted on March 31, 2009)

کے نفاذ سے خواتین کے حالات میں قدرے بہتری آئی، تاہم ان کی آبروریزی، ان پر گھریلو تشدد اور زیادتی کا سنگین مسئلہ موجود رہا۔ غیرت کے نام پر قتل اور امتیازی قوانین کی وجہ سے خواتین اور اقلیتیں متاثر ہوتی رہیں۔ مذہبی آزادی کی خلاف ورزیاں اور فرقہ وارانہ محاذ آرائی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ انسانوں کی اسمگلنگ، بچوں سے مشقت لینے اور ان کی نقل و حرکت پر پابندی کے مسائل بھی موجود رہے۔ اسی طرح بچوں سے زیادتی، ان سے پیشہ کرانے، معذوروں سے امتیاز برتنے اور مزدوروں کے حقوق کی پامالی کے مسائل بھی موجود رہے۔

فاٹا اور صوبہ سرحد میں فوجی آپریشن کے نتیجہ میں 1,150 شہری ہلاک ہوئے، جبکہ 825 شہری جنگجوؤں کے حملوں میں مارے گئے۔ پورے ملک خصوصاً کرم ایجنسی میں فرقہ وارانہ فسادات میں اندازاً 1,125 افراد ہلاک ہوئے۔ ملک میں 65 سے زیادہ خودکُش دھماکے ہوئے، جن سے تقریباً 970 لوگ ہلاک ہوئے۔ بلوچستان میں کم شدت کی شورش جاری رہی، جس میں اطلاعات کے مطابق تقریباً 125 شہری ہلاک ہوئے۔ جنگجوؤں کے ساتھ جاری جھڑپوں کے نتیجے میں بہت سے لوگ بے گھر ہوگئے۔ سال کے اختتام پر صوبہ سرحد اور فاٹا میں بے گھر افراد کی تعداد اندازاً 200,000 تھی۔ پنجاب اور صوبہ سرحد میں سیلاب کی وجہ سے اور بلوچستان میں زلزلے کے باعث 300,000 لوگ بے گھر ہوئے۔

انسانی حقوق کا احترام

سیکشن 1: انسانی جان کا احترام بشمول مندرجہ ذیل جرائم کے خلاف تحفظ

الف: من مانے طریقہ سے یا خلاف قانون کسی شخص کی جان لینا

زیرِ نظر سال کے دوران سیاسی وجوہات کی بنا پر ہلاکتوں اور سرکاری ایجنٹوں کے ہاتھوں لوگوں کو من مانے طریقہ سے یا خلاف قانون ہلاک کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی طرح فوجی آپریشن کے دوران عام شہریوں کی خلاف قانون اور من مانی ہلاکتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ (دیکھئے سیکشن 1.g.)

جعلی مقابلوں اور زیرِ حراست افراد کو اذیتیں دینے کے باعث نیز سیاسی مخالفین کو نشانہ بنانے کے باعث بھی بعض ہلاکتیں ہوئیں۔ نومبر میں انسانی حقوق اور قیدیوں کی امداد کے بارے میں ایک غیر سرکاری تنظیم 'شارپ' کی رپورٹ کے مطابق پولیس مقابلوں میں 64 شہری اور جیل میں نظر بند 101 افراد ہلاک ہوئے۔ پولیس کا کہنا تھا کہ یہ ہلاکتیں اس وقت ہوئیں، جب مشتبہ ملزمان نے فرار ہونے کی کوشش کی یا گرفتاری دینے سے انکار کیا یا خود کُشی کر لی۔ تاہم انسانی حقوق کے مبصرین، اہل خانہ اور میڈیا نے بتایا کہ اکثر ہلاکتیں سیکورٹی فورسز کے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوئیں۔

حکومت نے کئی بار ماورائے عدالت ہلاکتوں کے کیسوں میں پولیس حکام کے خلاف چھان بین کی اور بعض پولیس اہلکاروں کو سزا بھی دی گئی۔ اگست 2008 میں انسپکٹر جنرل پنجاب پولیس کی رپورٹ کے مطابق صوبائی پولیس نے اپنے 973 اہلکاروں کے خلاف مختلف جرائم پر انضباطی کارروائی کی۔ تاہم انضباطی کارروائی کی طوالت، تاخیر یا کارروائی نہ ہونے کے باعث پولیس اہلکاروں کی من مانی کارروائیاں جاری رہیں۔

24 جنوری کو پنجاب میں خانیوال کے قریب ایک شخص اللہ بخش ایک رات پولیس حراست میں رہنے کے بعد ہلاک ہوگیا۔ پاکستان کے انسانی حقوق کے کمیشن کے مطابق اللہ بخش کی موت ایذا رسانی کے باعث ہوئی، تاہم پولیس کا کہنا تھا کہ وہ دل کی حرکت بند ہونے سے ہلاک ہوا ہے۔

انسانی حقوق کمیشن کے مطابق 4 یا 5 مئی کو لاہور کے ایک پولیس اسٹیشن میں ایک پولیس اہلکار جعفر حسین اور دو اور اہلکاروں نے مبینہ طور پر رفیق

(Posted on March 31, 2009)

مسیح کو اذیتیں دے کر ہلاک کر ڈالا۔ ایک پولیس اہلکار نے صحافیوں کو بتایا کہ رفیق مسیح کے نچلے دھڑ پر تشدد کے نشان تھے۔ سرکاری طور پر بتایا گیا کہ یہ (ہلاکت دل کی حرکت بند ہونے سے ہوئی ہے۔ تاہم حکام کا کہنا تھا کہ تشدد کا امکان مسترد نہیں کیا جا سکتا اور تینوں پولیس اہلکاروں کے خلاف قتل کا مقدمہ درج کیا گیا۔

18 اگست کو شیخوپورہ، پنجاب میں پولیس نے مبینہ طور پر ایک شخص فلک شیر کو دوران حراست اذیتیں دیں۔ بعد میں اس کی لاش ایک قریبی کھیت سے ملی۔ اس ہلاکت کے خلاف علاقے کے لوگوں نے مظاہرہ کیا، جس پر ڈسٹرکٹ پولیس افسر نے تفتیشی افسر ارشد لطیف کے خلاف کیس درج کیا اور سب انسپکٹر اور ایس ایچ او محمد خالد کو معطل کر دیا گیا۔ نومبر میں فلک شیر کے وارثوں کا مالی معاوضہ دے کر یہ کیس ختم کر دیا گیا۔

پاکستان کے انسانی حقوق کمیشن کے مطابق 15 اکتوبر کو کراچی کے ضلع ملیر میں جیل کے گارڈز نے جیل میں ہنگامہ کرنے والے قیدیوں پر گولی چلا دی، جس سے تین قیدی ہلاک ہو گئے۔ چوتھے قیدی کو کند ہتھیار سے ہلاک کیا گیا۔ جیل کے گارڈز کو مبینہ طور پر اس وجہ سے گولی چلانے کا حکم دیا گیا کہ کہیں قیدی جیل توڑ کر فرار نہ ہو جائیں۔ 16 اکتوبر کو حکام نے 69 قیدیوں کے خلاف مختلف الزامات کے تحت مقدمات درج کرا دیئے۔ جیل حکام نے 225 'اہم مجرموں' کو دوسری جیلوں میں بھیج دیا، جبکہ پانچ جیل اہلکاروں اور ایک پولیس اہلکار کو بھی معطل کر دیا۔

سال کے اختتام پر حکام نے کراچی میں علی نواز نامی ایک شخص کی 2007 میں دوران حراست ہلاکت کیس میں ملوث دو پولیس افسروں کا تبادلہ کر دیا۔ اگرچہ ایک ڈاکٹر نے مبینہ طور پر علی نواز کے خاندان کو بتایا کہ اس کی موت گردے کی خرابی کی وجہ سے ہوئی ہے تاہم اس کے خاندان والوں کا کہنا تھا کہ علی نواز کے جسم پر تشدد کے نشان تھے اور اس کے سر، گردن، بائیں گردے، ٹانگوں اور کمر پر زخم موجود تھے۔ شروع میں پولیس نے اس واقعے پر کسی قسم کی کارروائی کرنے سے انکار کر دیا، لیکن جب بہت سے شہریوں نے پولیس پر دباؤ ڈالا تو پولیس نے علی نواز کے والد کی طرف سے مقدمہ درج کر لیا۔

سپریم کورٹ کے ایڈیشنل رجسٹرار سید حماد رضا کی مئی 2007 میں ہلاکت کا مقدمہ 2008 کے اختتام تک راولپنڈی کی انسداد دہشت گردی کی عدالت میں جاری تھا۔ اس کیس کی ابتدائی تفتیش کے بعد پولیس کا کہنا تھا کہ حماد رضا کا قتل ڈکیتی کی ایک واردات میں ہوا ہے۔ تاہم اس کے خاندان اور اس کی قانونی برادری کے ساتھیوں کا کہنا تھا کہ اسے سیکورٹی ایجنسیوں نے قتل کرایا ہے، کیونکہ اس وقت کے معزول چیف جسٹس افتخار چوہدری کے ساتھ اس کے روابط تھے۔

ملک ظہیر، جس پر عارف بھنڈر کے قتل کا مقدمہ چل رہا تھا، ستمبر 2007 میں ہلاک ہو گیا۔ اس کی ہلاکت کے بارے میں ابتدائی تفتیش میں کہا گیا کہ اس کی موت قدرتی موت تھی۔ تاہم بعد کی تحقیقات سے پتہ چلا کہ ملک ظہیر کے جسم پر تشدد کے نشان تھے۔ اس کے رشتہ داروں نے یہ شواہد ملنے پر لاہور ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ 2008 کے اختتام تک مقدمے کی کارروائی جاری تھی۔

پنجاب کے اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل عارف بھنڈر کے قتل کا مقدمہ، جسے جنوری 2007 میں لاہور میں قتل کیا گیا تھا، لاہور کی انسداد دہشت گردی کی عدالت میں سال کے اختتام تک جاری تھا۔

چترال میں حبیب الرحمٰن نامی شخص کی ہلاکت کے بارے میں، جو 2006 میں دوران حراست ہلاک ہو گیا تھا، کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ اس کی موت سے پہلے ڈاکٹری رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ حبیب الرحمٰن کو زدوکوب کیا گیا ہے اور وہ نازک حالت میں ہے۔

2008 کے دوران سیاسی دھڑوں یا نامعلوم حملہ آوروں کے ہاتھوں لوگوں کے قتل ہونے کی اطلاعات بھی ملیں، جنھیں سیاسی مقاصد کے تحت قتل کیا گیا۔ اس طرح کی کچھ مثالیں درج ذیل ہیں:

(Posted on March 31, 2009)

یورپی یونین کے انتخابی مبصرین نے بتایا کہ پیپلز پارٹی کی سابق سربراہ بینظیر بھٹو کے قتل کے علاوہ، جنھیں دسمبر 2007 میں ہلاک کیا گیا تھا، فروری 2008 کی انتخابی مہم کے دوران مختلف پارٹیوں کے 100 سے زیادہ حامی ہلاک ہوئے، جبکہ پارٹیوں کے حامیوں کے درمیان جھڑپوں میں بھی 50 افراد ہلاک ہوئے۔

زیرنظر سال کے دوران فاٹا اور صوبہ سرحد میں کئی قبائلی سردار اور سیاسی لیڈر قتل کئے گئے۔ ان میں اے این پی، پی پی پی، پی پی پی (شیر پاؤ) اور پختونخواہ ملی عوامی پارٹی کے گیارہ ممبران شامل ہیں۔ سیاسی ہلاکتوں کے جو بڑے بڑے واقعات ہوئے، ان میں 9 فروری کو چارسدہ میں اے این پی کے جلسے میں بم دھماکہ شامل ہے، جس میں 27 سے زیادہ لوگ مارے گئے تھے۔ اس کے علاوہ 11 فروری کو شمالی وزیرستان میں ایک خودکُش حملے میں اے این پی کے دو مقامی لیڈر اور چھ دوسرے افراد ہلاک ہوگئے تھے، جبکہ قومی اسمبلی کا ایک امیدوار زخمی ہوگیا تھا۔ پاراچنار، فاٹا میں الیکشن سے دو دن پہلے ایک امیدوار کے دفتر کے باہر دھماکے میں 37 افراد ہلاک ہوئے۔ اگست کے اواخر میں سوات، صوبہ سرحد میں اے این پی کے مقامی لیڈروں اور پختونخواہ ملی عوامی پارٹی کے ایک سابق ضلعی صدر پر حملہ ہوا، جبکہ ضلع بونیر میں 28 دسمبر کو قومی اسمبلی کی ایک نشست کے ضمنی الیکشن کے موقع پر ایک پولنگ اسٹیشن پر کار بم دھماکا ہوا۔

2008 کے دوران متحدہ قومی موومنٹ (ایم کیو ایم) کے ذرائع نے، جس کا کراچی میں سب سے زیادہ اثر ورسوخ ہے، جماعت اسلامی کے کارکنوں پر الزام لگایا کہ انھوں نے ایم کیو ایم کے 19 ارکان کو ہلاک کیا ہے، جن میں کراچی یونیورسٹی کا ایک طالب علم بھی شامل ہے۔ ان دونوں پارٹیوں کے درمیان تشدد کا سلسلہ جاری رہا۔ دونوں پارٹیاں صوبے پر اپنا سیاسی کنٹرول حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ ایم کیو ایم کے 19 میں سے 14 ارکان 29 اور 30 نومبر کو نسلی فسادات میں ہلاک ہوئے۔ جماعت اسلامی نے الزام لگایا کہ ایم کیو ایم نے اس کے 13 کارکنوں کو ہلاک کیا ہے۔

9 اپریل کو کراچی میں ایم کیو ایم کے وکلاء اور دوسرے وکلاء کے درمیان جھڑپوں میں 9 افراد ہلاک ہوئے۔ حکام کو وکلاء کے دفاتر میں سات لاشیں ملیں۔ لاہور میں ایک روز پہلے سابق وزیر شیر افگن نیازی پر ہونیوالے حملے کے بعد ہجوم نے 40 گاڑیوں کو آگ لگادی۔

مئی 2007 میں معزول چیف جسٹس افتخار چوہدری کی کراچی آمد کے موقع پر مظاہروں کے دوران مختلف پارٹیوں سے تعلق رکھنے والے 40 سے زیادہ کارکنوں کی ہلاکت کے بعد گرفتار ہونے والوں کیخلاف سندھ ہائی کورٹ میں مقدمہ 2008 کے اختتام تک جاری تھا۔ بہت سے مبصرین نے ایم کیو ایم کو اس تشدد کا ذمہ دار قرار دیا، کیونکہ وہ مخلوط حکومت میں شامل تھی، جسے سندھ پر کنٹرول حاصل تھا اور یہ اطلاعات ملی تھیں کہ اس حکومت نے پولیس کو حکم دیا تھا کہ وہ مظاہروں والی جگہ پر نہ جائے۔ ایم کیو ایم کے عہدیداروں نے تشدد کا ذمہ دار ہونے کی تردید کی اور کہا کہ ہلاک ہونیوالوں میں 18 ایم کیو ایم کے کارکن تھے۔ حکام نے بعد میں ایم کیو ایم پر الزام لگایا کہ اس نے مقدمے میں رکاوٹ ڈالنے کے لئے مظاہرے کرائے۔

جولائی 2007 میں اسلام آباد میں ایک سیاسی جلسے کے دوران جو خودکش حملہ ہوا تھا اور جس میں 11 پولیس اہلکار اور 8 عام شہری ہلاک ہوگئے تھے، اس واردات کا مقدمہ سال کے اختتام تک انسداد دہشت گردی کی عدالت میں جاری تھا۔ پولیس نے ستمبر 2007 میں تین افراد کو گرفتار کیا تھا۔

اکتوبر 2007 میں سابق وزیراعظم بینظیر بھٹو کی وطن واپسی پر کراچی میں ان کے خیرمقدمی جلوس پر دو خودکُش حملہ آوروں کے کیس میں، جس میں 130 سے زیادہ شہری اور 11 پولیس اہلکار ہلاک ہوگئے تھے، پولیس نے کوئی گرفتاری نہیں کی۔ 17 اکتوبر کو ڈسٹرکٹ کورٹ کراچی نے حکم دیا کہ پنجاب کے سابق وزیراعلیٰ پرویز الٰہی، انٹلی جنس بیورو کے سابق ڈائریکٹر جنرل اعجاز شاہ اور آئی ایس آئی کے سابق ڈائریکٹر جنرل حمید گُل کے خلاف مقدمہ درج کیا جائے۔

(Posted on March 31, 2009)

10 جولائی کو اقوام متحدہ نے حکومت پاکستان کی اس درخواست سے اصولی طور پر اتفاق کیا کہ دسمبر 2007 میں پیپلز پارٹی کی سابق سربراہ بینظیر بھٹو کے قتل کی تحقیقات شروع کی جائیں گی۔ اس واقعے میں بینظیر بھٹو کے کم از کم 30 حامی اور پولیس اہلکار بھی ہلاک ہوئے تھے۔ اسکاٹ لینڈ یارڈ نے جنوری میں اس واقعے کی چھان بین میں مقامی حکام کی مدد کی، لیکن اس بات کی تحقیق نہیں کی کہ حملے کے پیچھے کس کا ہاتھ تھا۔ سال کے اختتام تک کوئی مشتبہ شخص حراست میں نہیں تھا۔

دسمبر 2007 کو، جس دن بینظیر بھٹو کا قتل ہوا، اسی دن کرال چوک میں پاکستان مسلم لیگ نون کے لیڈر نواز شریف کے سیاسی جلسے میں بھی فائرنگ ہوئی تھی، جس میں سات افراد ہلاک ہوگئے تھے، تاہم 2008 کے اختتام تک اس واقعے کے سلسلے میں کوئی گرفتاری نہیں ہوئی تھی۔

سال کے اختتام تک سپریم کورٹ نے اسلام آباد کی لال مسجد میں مسلح جنگجوؤں کے خلاف جولائی 2007 کے فوجی آپریشن کی قانونی حیثیت کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں دیا تھا، جس میں 106 افراد ہلاک ہوئے تھے۔ حکومت نے مسجد سے ملحقہ مدرسہ کھولنے کی اجازت نہیں دی، تاہم ایک دوسرے مدرسہ 'جامعہ فریدیہ' کو سرکاری نگرانی میں دوبارہ کھولنے کی اجازت دے دی گئی۔

عبادت گاہوں، مذہبی اجتماعات اور فرقہ پرست اور مذہبی انتہاپسند گروپوں کے لیڈروں اور فاٹا سے باہر دہشت گرد گروپوں سے تعلق رکھنے والے لیڈروں پر حملوں کا سلسلہ جاری رہا، جس سے سینکڑوں ہلاکتیں ہوئیں۔ اس طرح کے واقعات کی چند مثالیں یہ ہیں:

8 اپریل کو کراچی میں مسلمان مزدوروں کے ایک ہجوم نے اپنے ایک ساتھی مزدور جگدیش کمار کو، جو ایک ہندو نوجوان تھا، زدوکوب کر کے مار ڈالا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے پیغمبر اسلام کی شان میں گستاخی کی تھی۔ اس کے اہل خاندان، انسانی حقوق کی تنظیموں اور سیاستدانوں نے اس الزام کو بے بنیاد قرار دیا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق پولیس نے اس الزام کی بنیاد پر مشتبہ افراد کو گرفتار کیا کہ انھوں نے توہین رسالت کے جرم کی پولیس کو کیوں اطلاع نہیں دی۔ اس واقعے کے بارے میں مقدمہ درج کرلیا گیا، لیکن سال کے اختتام تک حکام نے قتل کے جرم میں کسی مشتبہ شخص کو گرفتار نہیں کیا تھا۔

4 مئی کو حافظ آباد، پنجاب میں ایک 19 سالہ عیسائی لڑکے عدیل مسیح کو اس جرم میں قتل کر دیا گیا کہ اس نے مبینہ طور پر ایک مسلمان لڑکی کو شادی کی پیشکش کی تھی۔ پولیس نے شروع میں کہا کہ یہ خودکشی کا کیس ہے، تاہم تفتیش کے بعد اس نے دو مسلمان نوجوانوں کو گرفتار کرلیا، جن پر قتل میں ملوث ہونے کا شبہ تھا۔ سال کے اختتام تک کیس کی تفتیش جاری تھی، لیکن کسی کو سزا نہیں ہوئی تھی۔

16 جون کو ڈیرہ اسمٰعیل خان، صوبہ سرحد میں ایک شیعہ مسجد میں بم دھماکے سے 4 نمازی ہلاک ہوگئے۔

7 ستمبر کو جیو ٹی وی کے مذہبی پروگرام کے میزبان عامر لیاقت حسین نے اعلان کیا کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق احمدیوں کا قتل واجب ہے اور دو علمائے دین کو، جو پروگرام میں بطور مہمان شریک تھے، کہا کہ وہ اس حکم کی توثیق کریں۔ عامر لیاقت حسین نے، جو مشرف حکومت میں وزیر مذہبی امور بھی رہ چکے ہیں، اگلے دن بھی اپنے بیان کا اعادہ کیا۔ چند دن کے اندر سندھ میں دو مقامی احمدی لیڈروں کو قتل کر دیا گیا۔ 8 ستمبر کو دو مسلح افراد نے میرپور خاص کے ہسپتال میں ایک احمدی ڈاکٹر اور مقامی لیڈر عبدالمنان صدیقی کو، جو اپنے خیراتی کام کے لئے مشہور تھا، قتل کر ڈالا۔ ان مسلح افراد نے ایک احمدی گارڈ اور دو مریضوں کو بھی گولی ماردی۔ ایک دن بعد مسلح افراد نے ایک اور مقامی احمدی لیڈر سیٹھ محمد یوسف کو نواب شاہ کے بازار میں قتل کر ڈالا۔ پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن نے کیس کی سرکاری تحقیقات کا مطالبہ کیا، تاہم سال کے اختتام تک حکومت نے ان ہلاکتوں کی تفتیش میں تعطل جاری رکھا۔ مقامی ذرائع ابلاغ اور انسانی حقوق کی تنظیموں نے فرقہ وارانہ تشدد کو ہوا دینے پر جیو کے پروگرام کی مذمت کی۔

بریلوی سنیوں کے میلاد کے اجتماع پر اپریل 2006 میں ہونیوالے خودکش حملے کے سلسلے میں کوئی پیشرفت نہیں ہوئی۔ اس واقعے میں 59

(Posted on March 31, 2009)

افراد ہلاک اور 100 سے زیادہ زخمی ہوگئے تھے۔لشکر جھنگوی کے ایک مشتبہ کارکن نے مبینہ طور پر اس جرم کا اعتراف کیا اور کراچی پولیس نے جولائی 2007 میں ایک مشتبہ شخص کو گرفتار کیا۔سال کے اختتام تک کیس زیر تفتیش تھا۔

سرگودھا کی ایک این جی او تانگھ وسیب کے مطابق ایک شیعہ لیڈر اور ممنوعہ شیعہ تنظیم تحریک جعفریہ پاکستان کے سابق ضلعی صدر سید بشیر حسین بخاری کے قتل کے کیس کے سلسلے میں کوئی گرفتاری نہیں ہوئی، جسے ستمبر 2006 میں سرگودھا کے مسلم بازار میں دو افراد نے قتل کر دیا تھا۔

ب: لوگوں کا لاپتہ ہو جانا

زیر نظر سال کے دوران سیاسی بنیاد پر لوگوں کو غائب کر دینے کے رجحان میں کمی آئی، تاہم پولیس اور سیکورٹی فورسز نے قیدیوں کو خفیہ مقامات پر رکھنے کا سلسلہ جاری رکھا اور ان کا اتا پتا بتانے سے انکار کیا۔پاکستان کے انسانی حقوق کمیشن کے مطابق نومبر میں سرکاری تحویل میں لئے جانے والے 1,100 افراد لاپتہ تھے۔2007 میں یہ تعداد 1,600 تھی۔27 اگست کو وزارت داخلہ نے اس بات کا اعتراف کیا کہ بلوچستان میں بہت سے افراد لاپتہ ہیں۔بعض افراد کی گمشدگی کا تعلق دہشت گردی اور قومی سلامتی سے تھا۔انسانی حقوق کی تنظیموں نے بتایا کہ لاپتہ افراد میں بہت سے سندھی اور بلوچ قوم پرست شامل ہیں۔ایمنسٹی انٹرنیشنل کے مطابق لاپتہ ہونے والوں میں بچے اور ان کے اہل خانہ بھی شامل ہیں۔

نومبر 2007 میں اس وقت کے صدر اور آرمی چیف مشرف نے آئین کو معطل اور سپریم کورٹ کے ججوں کو برطرف کرنے کا جو فیصلہ کیا، اس سے تقریباً 600 لاپتہ افراد کے کیسوں پر کارروائی رک گئی، جو اس وقت کے چیف جسٹس افتخار چوہدری نے شروع کر رکھی تھی اور جس کا مقصد یہ تھا کہ حکومت یا تو لاپتہ افراد کو رہا کر دے یا ان کے مقدمات کو باضابطہ شکل دے، جنھیں مختلف سیکورٹی ایجنسیوں نے خفیہ مقامات پر رکھا ہوا ہے۔

14 ستمبر کو کراچی میں اسامہ وحید نامی ایک شخص لاپتہ ہوگیا۔اس کے بھائی نے سندھ ہائی کورٹ میں اس واقعے کے خلاف درخواست دائر کی۔پولیس کا کہنا تھا کہ اس نے اسامہ وحید کو گرفتار نہیں کیا۔تاہم ہائی کورٹ کے ڈویژن بنچ نے کراچی پولیس کو حکم دیا کہ اس کیس کی مزید تفتیش کی جائے۔سال کے اختتام تک اسامہ وحید کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کہاں ہے۔

18 اکتوبر کو سادہ کپڑوں میں ملبوس اہلکاروں نے کراچی میں ایک شخص ذی شان جلیل کو گرفتار کیا۔اس کی اہلیہ نے اس گرفتاری کے خلاف سندھ ہائی کورٹ میں درخواست دائر کی۔پولیس نے جلیل نامی کسی شخص کی گرفتاری کی تردید کی، تاہم ہائی کورٹ کے ڈویژن بنچ نے کراچی پولیس کو حکم دیا کہ واقعے کی مزید تفتیش کی جائے۔سال کے اختتام تک جلیل کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کہاں ہے۔

وحید قنبرانی اور شیر دل خان کو جون 2007 میں خضدار، بلوچستان میں ایک ریستوران سے گرفتار کیا گیا تھا اور ایک مہینے تک کسی نامعلوم مقام پر رکھا گیا۔زیر نظر سال کے دوران وہ بدستور نظر بند رہے۔ان کے خلاف الزامات کی تفصیلات معلوم نہیں ہوسکیں۔انھیں دسمبر 2007 میں خضدار کے ایک حراستی مرکز میں پیش کیا گیا تھا۔

اگست میں حکام نے عبدالرؤف ساسولی اور سعید بروہی کو رہا کر دیا۔انھیں فروری 2006 میں گرفتار کیا گیا تھا۔یہ دونوں بلوچ قوم پرست جماعت جمہوری وطن پارٹی کے رکن تھے اور ساسولی، جمہوری وطن پارٹی کے عالی بگٹی دھڑے کا سیکرٹری جنرل منتخب ہوا تھا۔

یکم مئی کو حکام نے ڈاکٹر صفدر سرکی کو رہا کر دیا۔وہ فروری 2006 میں اس وقت لاپتہ ہوگیا تھا، جب مبینہ طور پر سادہ کپڑوں میں ملبوس 16 سیکورٹی اہلکاروں نے اسے گرفتار کیا تھا۔سرکی کو، جو ایک امریکی شہری تھا اور جس کے پاس دوہری شہریت تھی، پہلی دفعہ اکتوبر 2007 میں جنوبی بلوچستان میں عدالت میں پیش کیا گیا۔رہائی سے پہلے حکام نے اسے شمالی بلوچستان کے دور دراز علاقے ژوب کی ایک جیل میں منتقل کر دیا تھا۔

(Posted on March 31, 2009)

ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ کے مطابق 2007 میں ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد عتیق الرحمٰن کے مشہور کیس میں کوئی پیشرفت نہیں ہوئی، جو ایک سائنس دان اور پاکستان اٹامک انرجی کمیشن کا افسر تھا اور 2004 میں لاپتہ ہوگیا تھا۔ اسی طرح سید ناصر علی شاہ کے کیس میں بھی کوئی پیشرفت نہیں ہوئی، جو اپریل 2007 میں لاپتہ ہوگیا تھا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے یہ رپورٹ بھی دی کہ ایک قیدی ڈاکٹر عمران منیر نے، جسے بعد میں رہا کردیا گیا تھا، بتایا کہ اس نے 2006 میں مسعود جنجوعہ کو حراست میں دیکھا تھا، جو 2005 میں لاپتہ ہوگیا تھا۔

ج: **ایذارسانی اور ظالمانہ، غیرانسانی یا توہین آمیز سلوک یا سزا**

اگرچہ قانون میں ایذارسانی اور ظالمانہ، غیرانسانی یا توہین آمیز سلوک کی ممانعت ہے، تاہم سیکورٹی فورسز نے، جن میں انٹیلی جنس سروسز بھی شامل ہیں، زیرحراست لوگوں کو اذیتیں دیں اور ان سے بدسلوکی کی۔ انسداد دہشت گردی ایکٹ کے تحت جبری اقبال جرم کو بھی انسداد دہشت گردی کی عدالتوں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ غیرسرکاری تنظیم شارپ کی رپورٹ کے مطابق جنوری اور جون کے درمیانی عرصے میں پولیس کی ایذارسانی کے 1013 کیس ہوئے، جن میں تقریباً 500 کیسوں کا تعلق پنجاب پولیس اور تقریباً 350 کا تعلق سندھ پولیس سے تھا۔ مبصرین نے بتایا کہ مقامی روایات کی وجہ سے صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ایذارسانی کے واقعات کی پوری تفصیلات معلوم نہیں ہوسکتیں۔ مبینہ ایذارسانی کی وجہ سے قیدیوں کے بری طرح زخمی ہونے یا ہلاک ہونے کے بعض واقعات بھی ہوئے۔

انسانی حقوق کی تنظیموں نے بتایا کہ ایذارسانی کے متعدد طریقے استعمال کئے گئے مثلاً ڈنڈوں اور کوڑوں سے مارنا، سگریٹ سے جسم کو داغنا، پاؤں کے تلووں پر چھڑیاں مارنا، لمبے عرصے تک تنہائی میں رکھنا، بجلی کے جھٹکے دینا، بھوکا رکھنا، سونے نہ دینا، الٹا لٹکانا، بیڑیوں کے ساتھ ٹانگیں پھیلانے پر مجبور کرنا وغیرہ۔

ایسی اطلاعات بھی ملیں کہ سیکورٹی فورسز کے اہلکاروں نے دوران تفتیش عورتوں کی آبروریزی کی۔ حکومت نے ایسے ملزمان کے خلاف بہت کم کارروائی کی۔ 2006 کے تحفظ نسواں ایکٹ سے پہلے، حدود قوانین کے تحت شریعت کی خلاف ورزی پر قرآنی سزائیں مقرر تھیں، جن میں ہاتھ کاٹنا اور سنگسار کرنا شامل ہے۔ تاہم ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی کہ حکام نے کسی کو اس طرح کی سزا دی ہو۔

14 مارچ کو انسانی حقوق کی ایشیائی تنظیم اے ایچ آر سی کی رپورٹ کے مطابق پولیس نے فیصل آباد میں ایک 17 سالہ لڑکی کو گرفتار کرلیا، جس پر یہ الزام تھا کہ اس نے اپنے منگیتر کو قتل کیا ہے۔ تنظیم کا کہنا ہے کہ گرفتاری کے بعد لڑکی کو اذیتیں دی گئیں، عدالت میں پیش کئے بغیر اسے 16 دن تک پولیس کی حراست میں برہنہ رکھا گیا، پولیس کے تفتیش کار شجاعت علی ملہی نے دوبار اس کی آبروریزی کی اور اسے اجتماعی آبروریزی کی دھمکی دی۔ مارچ کے اختتام پر حکام نے اس کی بڑی بہن کو بھی کسی الزام یا عدالتی حکم کے بغیر گرفتار کرلیا اور اذیتیں دیں۔

6 اگست کو مقامی میڈیا کے مطابق حیدرآباد میں پولیس نے آغا محبوب احمد کے گھر پر بغیر وارنٹ کے چھاپہ مارا اور بینک ڈکیتی میں ملوث ہونے کے الزام میں گرفتار کرلیا۔ اسے حیدرآباد سی آئی اے سنٹر میں لے جایا گیا اور مبینہ طور پر اذیتیں دی گئیں۔

ستمبر 2007 میں ایک مقامی بااثر شخص نے سندھ میں جنوری 2007 کے حضور بخش ملک گرفتاری کیس میں مصالحت کرائی۔ حضور بخش کو قومی شناختی کارڈ اپنے پاس نہ رکھنے کی وجہ سے مارکیٹ سے گرفتار کیا گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ حراست کے دوران تھانیدار محمد ٹونیو نے اسے پوشیدہ اعضا پر اذیتیں دیں۔

فروری 2007 میں لاہور میں گاڑیوں کی چیکنگ کی ایک چوکی پر ایک خاتون کی اجتماعی آبروریزی کے الزام میں گرفتار ہونے والے پانچ

(Posted on March 31, 2009)

پولیس اہلکار سال کے اختتام تک جیل میں تھے اور ان کیخلاف مقدمہ چل رہا تھا۔ متاثرہ خاتون کے خاندان والوں نے لاہور پولیس انتظامیہ میں کیس کی پیروی کی، جس پر پانچ پولیس اہلکار مجرم پائے گئے اور انھیں تحفظ خواتین ایکٹ کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔ خواتین کی غیر سرکاری تنظیم عورت فاؤنڈیشن نے بتایا کہ سال کے اختتام تک تمام مجرمان قید میں تھے۔

مبارک علی کیس میں کوئی پیشرفت نہیں ہوئی۔ مبارک علی کو جولائی 2007 میں اس وقت گرفتار کرلیا گیا تھا، جب اس نے ایک مقامی پولیس اہلکار کے رویئے کے خلاف شکایت درج کرائی تھی۔ حراست کے دوران پولیس نے مبینہ طور پر اسے لوہے کی سلاخوں اور ڈنڈوں سے مارا پیٹا، جس سے وہ اپنی ایک ٹانگ اور بینائی سے محروم ہوگیا۔ جب یہ معاملہ میڈیا میں اٹھایا گیا تو پولیس نے تفتیش کی اور تین پولیس اہلکاروں کو معطل کردیا۔ یہ ملزمان اگست میں غائب ہوگئے۔ مبارک علی کے خاندان والوں کا کہنا تھا کہ پولیس نے ملزمان کو فرار ہونے میں مدد دی۔

اسلام آباد میں شہناز فاطمہ اور جویریہ عالم کے جون 2006 کے آبروریزی کیس یا جولائی 2006 کے اڈیالہ جیل گل واعظ تشدد اور ایذا رسانی کیس میں ملوث پولیس اہلکاروں کیخلاف کوئی سرکاری کارروائی نہیں ہوئی۔

ملتان کے 2006 کے عارف علی اور عرفان علی ایذا رسانی کیس میں مبینہ طور پر ملوث ایس ایچ او سعادت علی کے خلاف سال کے اختتام تک کوئی فرد جرم عائد نہیں کی گئی تھی۔

جیلوں اور حراستی مراکز کے حالات

جیلوں کے حالات نہایت ناقص پائے گئے، جو بین الاقوامی معیار پر پورا نہیں اترتے۔ جیلوں میں دولتمند اور بااثر قیدیوں کی کوٹھڑیوں کے سوا باقی جگہ گنجائش سے زیادہ قیدی رکھے گئے۔ شارپ تنظیم کے مطابق 87 جیلوں میں تقریباً 90,000 قیدی تھے، جبکہ ان میں گنجائش صرف 36,075 قیدیوں کی تھی۔

جیلوں میں خوراک اور علاج کی ناکافی سہولیات کی وجہ سے بہت سے قیدی بیماریوں میں مبتلا ہوتے رہے اور ان میں کم غذائیت کا مسئلہ بھی پیدا ہوا۔ صرف ان قیدیوں کی حالت بہتر رہی، جنھیں عزیز و اقارب کی طرف سے کھانا ملتا رہا۔ غیر ملکی قیدی، سزا کی مدت کاٹنے کے کافی عرصہ بعد تک قید میں رہے، کیونکہ وطن واپس جانے کے لئے ان کے پاس اخراجات نہیں تھے۔

پولیس نے مبینہ طور پر حراست کے دوران لوگوں کو اذیتیں دیں اور ان سے بدسلوکی کی اور بعض اوقات لوگوں کو ماورائے عدالت ہلاک بھی کیا۔ عیسائیوں اور احمدیوں نے بتایا کہ انھیں پولیس کی بدسلوکی کا زیادہ خطرہ رہتا ہے۔ مسلمانوں کے مقابلے میں غیر مسلم قیدیوں کو اکثر کم سہولیات دی گئیں اور غیر مسلم قیدیوں پر مسلم قیدیوں نے اکثر اوقات تشدد بھی کیا۔

یکم فروری کو مقامی میڈیا نے اطلاع دی کہ روات، راولپنڈی کا رہائشی عرفان خان معدے کی خرابی کی وجہ سے جیل میں انتقال کرگیا۔ مبینہ طور پر اسے معدے اور آنتوں کے السر کی شکایت تھی، لیکن جیل اسٹاف نے اس کی خوراک اور علاج پر کوئی توجہ نہ دی۔ جیل کا عملہ اس کے خاندان سے اس کے لئے کھانا لانے پر رشوت طلب کرتا تھا۔

18 فروری کو اڈیالہ جیل میں ایک عیسائی قیدی جان مسیح نمونیا کی وجہ سے انتقال کرگیا۔ گلوبل فاؤنڈیشن تنظیم کے مطابق جان مسیح کے علاج پر مناسب توجہ نہیں دی گئی تھی۔ جیل میں اس کے علاج کے لئے مناسب انتظامات ہی نہیں تھے۔

(Posted on March 31, 2009)

27 جون کو سہالہ جیل، راولپنڈی کا قیدی ادریس احمد دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گیا۔ گلوبل فاؤنڈیشن کے مطابق وہ بار بار مدد کے لئے پکارتا رہا، لیکن جیل کے عملے نے کوئی توجہ نہ دی۔

اڈیالہ جیل میں سزائے موت کا انتظار کرنے والے ایک قیدی مرزا سرفراز کی طرف سے ایذا رسانی کی ایک شکایت کے بعد جون میں عدلیہ نے جیلوں اور محکمہ جیل کے حالات کے بارے میں انکوائری کا حکم دیا۔ انکوائری سے معلوم ہوا کہ ایسے قیدی، جو رشوت نہیں دیتے، ان سے انتقام لیا جاتا ہے۔ انکوائری کرنے والے ججوں نے سفارش کی کہ انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات ایک مشترکہ عدالتی اور محکمانہ کمیشن قائم کرے، جو اس معاملے کا مفصل جائزہ لے۔ سال کے اختتام تک اس بارے میں مزید کوئی پیشرفت نہیں ہوئی تھی۔

جیلوں میں ہنگاموں کی بھی اطلاعات ملیں، جو زیادہ تر جیلوں میں خراب رہائشی حالات کی وجہ سے ہوئے۔ 15 ستمبر کو قیدیوں نے اس وقت ہنگامہ کیا، جب حکام نے سزائے موت کا انتظار کرنے والے ایک قیدی محمد یوسف کی درخواست نامنظور کر دی، جو اپنی والدہ کے جنازے میں شرکت کرنا چاہتا تھا۔ اسے اس طرح کی درخواست کرنے پر دوسرے قیدیوں کے سامنے مارا پیٹا بھی گیا۔ سندھ کے انسپکٹر جیل خانہ جات نے ان ہنگاموں کی وجہ سے جیل ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اور اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ کو معطل کر دیا۔

4 اکتوبر کو حیدرآباد سنٹرل جیل کے قیدیوں نے بنیادی سہولتوں کے فقدان اور عملے کی کرپشن کے خلاف ہنگامہ کیا۔ 1,000 سے زیادہ قیدی اپنی کوٹھڑیوں سے باہر نکل آئے اور 40 قیدیوں کی قید تنہائی اور جیل کے خراب حالات پر احتجاج کیا۔ جھڑپوں میں پولیس نے چار قیدیوں کو زخمی کر دیا۔ قیدیوں نے اپنا احتجاج اس وقت ختم کیا جب حکام نے انھیں تحریری یقین دہانی کرائی کہ انھیں اذیتیں نہیں دی جائیں گی۔ سندھ کے اٹارنی جنرل نے ایذا رسانی کے الزامات کی تحقیقات کرانے کا بھی وعدہ کیا۔

اکتوبر میں کراچی، ملتان اور تیمر گڑھ کی جیلوں میں ہنگامے ہوئے۔ قید خانوں کے مسائل کے بارے میں کام کرنے والی غیر سرکاری تنظیم گلوبل فاؤنڈیشن کے مطابق راولپنڈی کی اڈیالہ جیل میں ضروری سہولتوں کے فقدان کے باعث اگست تک 20 اموات واقع ہوئیں۔

جیل حکام نے کم عمر قیدیوں کو بھی بالغ قیدیوں کی طرح کے حالات میں رکھا، البتہ انھیں الگ بیرکوں میں رکھا گیا۔ پولیس نے عموماً نظر بند لوگوں اور سزا یافتہ مجرموں کو الگ الگ نہیں رکھا۔ ذہنی طور پر بیمار قیدیوں کی دیکھ بھال کے مناسب انتظامات نہیں کئے گئے اور انھیں عام قیدیوں سے الگ رکھنے کا بھی انتظام نہیں کیا گیا۔

2005 میں ان شکایات کے بعد کہ زیر حراست خواتین کے ساتھ بدسلوکی ہوتی ہے اور ان کی آبروریزی کی جاتی ہے، حکام نے خواتین کے خصوصی پولیس اسٹیشنوں کی تعداد بڑھا دی، جہاں پورا عملہ خواتین پر مشتمل ہوتا ہے۔ عورت فاؤنڈیشن نے اپنی رپورٹ میں بتایا کہ یہ پولیس اسٹیشن مناسب طریقے سے کام نہیں کر رہے، کیونکہ ان کے پاس وسائل اور تربیت یافتہ عملے کی کمی ہے۔ عدالتی احکامات اور قواعد وضوابط کے تحت خاتون ملزمان سے مرد پولیس اہلکار تفتیش نہیں کر سکتے، لیکن اکثر ایسا ہوا کہ مرد پولیس اہلکاروں نے عام پولیس اسٹیشنوں میں خواتین کو حراست میں رکھا اور ان سے پوچھ گچھ کی۔

اگرچہ قوانین میں قیدیوں کو پروبیشن پر رہا کرنے کی دفعات شامل ہیں، لیکن اکثر اوقات ایسا ہوا کہ وسائل کی کمی کی وجہ سے اس سہولت پر عمل نہ کیا جا سکا۔

ریڈ کراس کا پاکستانی حکام کے ساتھ سمجھوتہ ہے کہ ریڈ کراس کے نمائندے ملک بھر میں آزادانہ طور پر جیلوں کا معائنہ کر سکتے ہیں لیکن سمجھوتے پر

(Posted on March 31, 2009)

صرف جزوی طور پر عمل کیا گیا اور سال کے اختتام پر پنجاب اور بلوچستان میں ریڈ کراس کے نمائندوں کے کوئی دورے نہیں ہو رہے تھے۔ مقامی، صوبائی اور قومی سطح پر حکام نے انسانی حقوق کی بعض تنظیموں اور میڈیا کے نمائندوں کو کم عمر قیدیوں اور خاتون قیدیوں کے حالات معلوم کرنے کی اجازت دی، تاہم مرد قیدیوں کے حالات معلوم کرنے کے لئے، جو انتہائی خراب ہیں، ان نمائندوں کے دورے بہت کم اور بے قاعدگی سے ہوئے۔

د: من مانی گرفتاری یا حراست

قانون میں لوگوں کی من مانی گرفتاریوں اور انھیں حراست میں لینے کی ممانعت ہے، لیکن حکام نے اکثر اس پابندی کی خلاف ورزی کی۔

پولیس اور سیکورٹی اداروں کا کردار

ملک کے زیادہ تر حصوں میں داخلی سلامتی کی ذمہ داری پولیس کے پاس ہے۔ پولیس آرڈر ترمیمی آرڈی ننس مجریہ 2006 کے تحت مقامی پولیس کا کنٹرول وزارت داخلہ کے پاس ہے تاہم صوبائی حکومتیں افسران کا تبادلہ کرنے کا اختیار رکھتی ہیں اور ضلعی ناظم پولیس افسران کی سالانہ کارکردگی کی رپورٹ لکھتا ہے، جس کی بنیاد پر ان کی ترقیاں ہوتی ہیں۔

فاٹا میں امن وامان برقرار رکھنا پولیٹیکل ایجنٹ کی ذمہ داری ہے اور اس کے لئے ایف سی آر قوانین نافذ ہیں۔ پولیٹیکل ایجنٹ صوبہ سرحد کے گورنر کے ذریعے صدر کو جواب دہ ہوتا ہے۔ فاٹا میں پولیس کی جگہ قانون نافذ کرنے والے متعدد ادارے ہیں، مثلاً

پیرا ملٹری فرنٹیئر کور: یہ زمانہ امن میں وزارت داخلہ کے تحت اور زمانہ جنگ میں آرمی کے تحت کام کرتی ہے۔

فرنٹیئر کانسٹیبلری: یہ فاٹا اور صوبہ سرحد کے درمیانی علاقے کی نگرانی کرتی ہے۔ لیویز: یہ فاٹا کی بعض ایجنسیوں میں کام کرتی ہیں اور پولیٹیکل ایجنٹ کے سامنے جوابدہ ہوتی ہیں۔ خاصہ دار: یہ فورس امن عامہ کیلئے پولیٹیکل ایجنٹ کی مدد کرتی ہے۔ لشکر: یہ قبائلی ملیشیا ہوتی ہے، جسے پولیٹیکل ایجنٹ یا دوسرے حکام عارضی نوعیت کی گڑبڑ پر قابو پانے کیلئے استعمال کرتے ہیں۔

رینجرز: یہ بھی پیرا ملٹری فورس ہے، جو وزارت داخلہ کے تحت کام کرتی ہے۔

مسلح افواج بیرونی سلامتی کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ زیر نظر سال کے دوران مسلح افواج کو بعض اوقات داخلی سلامتی کی ذمہ داریاں بھی سونپی گئیں۔

پولیس میں کرپشن عام رہی۔ خصوصاً نچلی سطح کے اہلکاروں میں کرپشن کی بڑی وجہ یہ رہی کہ ان کی تنخواہیں کم ہیں اور حالات کار خراب ہیں۔

ایسے بھی واقعات ہوئے کہ پولیس نے جائز مقدمات کے اندراج کے لئے بھی فیس طلب کی اور ناجائز مقدمات کے لئے رشوت لی۔ الزامات سے بچنے کے لئے رشوت دینے کے واقعات عام ہوئے۔ بعض دفعہ لوگوں نے اپنے مخالفین کو تنگ کرنے اور ان سے انتقام لینے کے لئے پولیس کو رشوت دی۔ ناقدین کیمطابق ایس ایچ او کا تقرر سیاسی بنیاد پر ہوتا ہے۔

پولیس کی کارکردگی ضلع وار ایک دوسرے سے کافی مختلف رہی۔ کہیں یہ معقول حد تک اچھی اور کہیں غیر موثر رہی۔ بعض پولیس اہلکاروں نے انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کیں یا انھوں نے سیاسی جانبداری سے کام لیا۔ اس طرح کے واقعات پر اکثر سزا نہ ملنے کی وجہ سے یہ احساس پیدا ہوا کہ پولیس کو کھلی چھٹی حاصل ہے۔ پولیس اور جیل حکام نے قیدیوں اور ان کے خاندان والوں سے رقم بٹورنے کے لئے انھیں اکثر دھمکیاں دیں۔ انسپکٹر

(Posted on March 31, 2009)

جنرل، ڈسٹرکٹ پولیس افسران، ضلع ناظمین، صوبائی وزیر اعلیٰ یا صوبائی وزیر داخلہ، وفاقی وزیر داخلہ، وزیر اعظم یا عدالتیں اس طرح کی زیادتیوں اور اختیارات کے ناجائز استعمال کے بارے میں محکمانہ تحقیقات اور انتظامی اقدامات کا حکم دے سکتی ہیں۔ انتظامی شاخ اور پولیس حکام تحقیقات کی سفارش کر سکتے ہیں اور عدالتیں فوجداری مقدمہ چلا سکتی ہیں اور بعض اوقات اس طرح کے اختیارات کو استعمال میں لایا گیا۔

پنجاب کی صوبائی حکومت نے تمام سطح کے پولیس اہلکاروں کی از سر نو تربیت کا باقاعدہ پروگرام شروع کیا، تاکہ انھیں ٹیکنیکل مہارت اور انسانی حقوق کے احترام سے متعلق قوانین اور ذمہ داریوں سے آگاہ کیا جا سکے۔ کراچی کی شہری حکومت نے بھی شہر کے انسانی حقوق سے متعلق اہلکاروں کی تربیت کا انتظام کیا۔ سال کے دوران کم از کم تین این جی اوز (بچوں کے حقوق کی سوسائٹی، ساحل اور شارپ) نے پولیس کو تربیت دی۔ پنجاب اور صوبہ سرحد میں پبلک سیفٹی کمیشن قائم کئے گئے، لیکن شارپ اور جی ایف کے مطابق ان کی کارکردگی ناقص رہی، جس کی بڑی وجہ انٹرنیشنل کرائسس گروپ کے بقول یہ رہی کہ ان کا دائرہ کار واضح نہیں اور صوبائی انتظامیہ ان کے کام میں مداخلت کرتی ہے۔ اگرچہ ڈسٹرکٹ پبلک سیفٹی کمیٹیاں پنجاب اور سندھ کے علاوہ سرحد اور بلوچستان کے بیشتر اضلاع میں موجود رہیں، تاہم ان کے پاس عملے کی کمی تھی، جس کی وجہ سے ان کی کارکردگی غیر موثر رہی۔ انٹرنیشنل کرائسس گروپ کے مطابق ان کمیٹیوں پر سیاسی دباؤ بھی ڈالا جاتا رہا۔

اگست 2007 تک حکومت نے بلوچستان کے 27 اضلاع میں سے 25 کو 'بی ایریا' سے 'اے ایریا' میں تبدیل کر دیا۔ بی ایریا کا کنٹرول مقامی لیوی فورس کے پاس ہوتا ہے، جو مقامی قبائلی سرداروں کے تابع ہوتی ہے، جبکہ اے ایریا کا کنٹرول پولیس کے پاس ہوتا ہے۔ 2006 میں لیوی فورس کی 3,560 نفری میں سے تقریباً 3,000 کو پولیس میں تبدیل کر دیا گیا اور تقریباً 1500 مقامی نوجوانوں کو نئی قائم ہونے والی پولیس میں بھرتی کیا گیا۔

ہیومن رائٹس واچ کے مطابق ایسے نوجوانوں کو، جو پاکستان سے کشمیر کے الحاق کے حامی نہیں، انھیں انٹیلی جنس اداروں اور فوج کے ذریعے ہراساں کیا گیا۔

سیاسی پارٹیوں نے بتایا کہ 2005 کے مقامی حکومتوں کے انتخابات کے مقابلے میں 2008 کے فروری کے عام انتخابات سے پہلے کے مہینوں میں مشرف حکومت کی طرف سے نسبتاً کم دخل اندازی کی گئی۔ کرائسس گروپ کے مطابق انتخابی مہم کے دوران حکومت نے خاص طور پر پولیس اور انٹیلی جنس ایجنسیوں کے ذریعے سیاسی مخالفین کو تنگ کیا۔ بعض اضلاع میں پولیس اہلکاروں نے جھوٹے الزامات کی بنیاد پر اپوزیشن کے کارکنوں کو گرفتار کیا اور اپوزیشن کے جلسوں میں رکاوٹ ڈالی۔

پولیس نے مذہبی اقلیتوں کو، جن میں عیسائی، احمدی اور شیعہ شامل ہیں، سماجی حملوں سے بچانے کے کام میں اکثر غفلت برتی۔

گرفتاری اور حراست

کسی گرفتاری کی قانونی بنیاد کے طور پر ایف آئی آر کا اندراج ضروری ہوتا ہے۔ پولیس اس وقت ایف آئی آر درج کرتی ہے، جب شکایت کنندہ کسی جرم کا معقول ثبوت پیش کرتا ہے۔ ایف آئی آر کے ذریعے پولیس نامزد ملزم کو 24 گھنٹے تک حراست میں رکھ سکتی ہے، جس کے بعد صرف مجسٹریٹ ہی اس کی حراست میں 14 دن کی توسیع کی منظوری دے سکتا ہے، بشرطیکہ پولیس یہ ثابت کرے کہ یہ حراست تفتیش کے لئے ضروری ہے۔ تاہم عملاً حکام نے ان پابندیوں پر عمل نہیں کیا۔ حکام نے اکثر لوگوں کو تنگ کرنے یا ڈرانے دھمکانے کے لئے بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے ان کے خلاف ایف

(Posted on March 31, 2009)

آئی آر درج کیں۔ ایسا بھی ہوا کہ ٹھوس ثبوت کے باوجود ایف آئی آر اس وقت تک درج نہیں گئی جب تک حکام کو رشوت نہیں دی گئی۔ پولیس نے بعض اوقات لوگوں کو بغیر الزام کے یا جھوٹے الزامات کی بنیاد پر حراست میں لے لیا تا کہ ان سے رشوت وصول کی جا سکے۔ بعض اوقات پولیس نے مفرور ملزمان کو رشتہ داروں کو بھی حراست میں لے لیا تا کہ ملزمان مجبور ہو کر پیش ہو جائیں۔

پولیس نے اکثر تفتیشی حراست کیلئے مجسٹریٹ سے منظوری نہیں لی اور ملزمان کو اس وقت تک حراست میں رکھا، جب تک کسی عدالت نے اسے چیلنج نہیں کیا۔ بعض خواتین کی دوران حراست آبروریزی کی گئی۔ مجسٹریٹوں سے جب بھی کسی ملزم کی تفتیشی حراست کی درخواست کی گئی تو انھوں نے اکثر حراست کی وجوہات معلوم کئے بغیر اس کی اجازت دیدی۔ پولیس اور مجسٹریٹوں نے بعض اوقات ملی بھگت سے بھی نئی ایف آئی آر کاٹی تا کہ کسی شخص کو 14 دن کی مقررہ مدت کے بعد بھی حراست میں رکھا جا سکے۔

عدالتوں نے صرف سزائے موت کے کیسوں میں ناداروں کیلئے وکلاء مقرر کئے۔ لوگوں کو قیدیوں سے ملاقات کے لئے اکثر رشوت دینی پڑی۔ غیر ملکی سفارت کاروں کو قیدیوں سے اس وقت ملاقات کی اجازت دی جاتی رہی، جب وہ عدالت میں پیش ہوتے تھے۔ غیر ملکی سفارت کاروں کو جیلوں میں قید اپنے ملکوں کے شہریوں سے ملاقات کی بھی اجازت دی جاتی رہی۔

ضلعی رابطہ افسر 90 دن تک حفاظتی تحویل کا حکم دے سکتا ہے اور عدالت کی منظوری سے اس مدت میں مزید 90 دن کی توسیع کر سکتا ہے۔ انسانی حقوق کی تنظیموں نے بتایا کہ کئی ایسے لوگ، جو مبینہ طور پر دہشت گرد تنظیموں سے تعلق رکھتے تھے، غیر معینہ مدت تک حفاظتی تحویل میں رکھے گئے۔ کرپشن کے کیسوں میں قومی احتساب بیورو 'نیب' مشتبہ شخص کو غیر معینہ مدت تک حراست میں رکھ سکتا ہے بشرطیکہ اس کیلئے ہر 15 دن بعد عدالتی منظوری حاصل کی جائے۔

قانون میں لازم قرار دیا گیا ہے کہ زیر حراست افراد پر 30 دن کے اندر مقدمہ شروع کیا جائے۔ حدود قوانین اور ضابطہ تعزیرات دونوں کے تحت کچھ جرائم قابل ضمانت اور کچھ نا قابل ضمانت ہیں۔ قابل ضمانت جرائم میں مقدمے کے فیصلے تک ضمانت منظور ہو سکتی ہے۔ ایسے نا قابل ضمانت جرائم پر بھی، جن میں 10 سال سے کم مدت کی سزا دی جا سکتی ہو، عدالت اپنی صوابدید پر ضمانت منظور کر سکتی ہے لیکن عملاً ججوں نے پولیس کی درخواست پر یا کسی طبقے کے کہنے پر یا رشوت لیکر ضمانت نامنظور کی۔ کئی کیسوں میں مقدمات فرد جرم عائد کرنے کے چھ ماہ بعد تک شروع نہیں ہوئے اور بعض کیسوں میں ملزمان مقدمہ شروع ہونے سے پہلے اس مدت سے زیادہ عرصہ تک حراست میں رہے، جو ایسے جرائم کے لئے مقرر ہے، جن میں وہ ماخوذ تھے۔ این جی اوز کے مطابق تقریباً 50 فیصد قیدی اپنا مقدمہ شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔

فروری کے پارلیمانی انتخابات سے پہلے تک حکومت نے مظاہروں، سیاسی جلسوں اور گڑبڑ کو روکنے کے لئے حفاظتی تحویل، اجتماعی گرفتاریوں اور طاقت کے بے تحاشا استعمال کا سہارا لیا۔ فروری میں منتخب ہونیوالی حکومت کے بارے میں ایسی کوئی اطلاعات نہیں ملیں کہ اس نے بھی اس طرح کے ہتھکنڈے استعمال کئے ہوں۔

فاٹا میں ایف سی آر کے تحت، پولیٹیکل ایجنٹوں کو قانونی اختیار حاصل ہے کہ وہ اجتماعی سزا دے سکتے ہیں، کسی کو حفاظتی تحویل کے تحت تین سال تک حراست میں رکھ سکتے ہیں اور ناپسندیدہ سرگرمیوں کو روکنے کے لئے 'ضمانت' طلب کر سکتے ہیں۔ انسانی حقوق کی تنظیموں نے اجتماعی سزا کے نظریئے پر اپنی تشویش کا اظہار کیا، کیونکہ حکام نے اس قانون کو مفرور ملزمان کے قبیلے والوں کو حراست میں لینے، ان کے مکان گرانے اور قبائلی علاقوں یا ملک کے دوسرے حصوں میں ان کی جائداد ضبط کرنے یا تباہ کرنے کے لئے استعمال کیا۔ اس کے علاوہ مفرور ملزم کی پیشی تک یا اس کے قبیلے کی طرف

(Posted on March 31, 2009)

سے اسے مقامی رسم ورواج کے مطابق سزا ملنے تک اس کے گاؤں کو محاصرے میں لینے کیلئے بھی اس قانون کو استعمال کیا۔

اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ فاٹا میں عدل و انصاف کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔وہ پولیٹیکل ایجنٹ کی نگرانی میں اور اس کے منتخب کردہ قبائلی سرداروں کی مدد سے اپنے فرائض ادا کرتے ہیں۔تاہم جنگجوؤں کی سرگرمیوں اور بدامنی کی وجہ سے اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹوں کے لئے عدالت لگانا مشکل ہوگیا۔ فاٹا میں جنگجوؤں کی طرف سے اپنی عدالتوں کے ذریعے شرعی سزاؤں کے نفاذ میں اضافہ ہوا۔ ان کی سزاؤں میں سرعام سر قلم کرنا،سنگسار کرنا،کوڑے مارنا اور جرمانہ عائد کرنا شامل ہے۔(دیکھئے سیکشن 1.g.)

نظریاتی طور پر پولیٹیکلا یجنٹوں اور ان کے نمائندوں کو مقدمات کی سماعت اسلامی قوانین اور قبائلی رسم و رواج کے مطابق کرنا ہوتی ہے۔مقدمات پر عام طور پر جو سزائیں دی جاتی ہیں،ان میں جرمانہ اور 14 سال تک قید شامل ہے۔ملزمان کو وکیل یا ضمانت کا کوئی حق حاصل نہیں ہوتا۔

سیاسی کارکنوں اور خصوصاً پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے بتایا کہ دسمبر 2007 میں بینظیر بھٹو کے قتل کے بعد کے مہینوں میں انھیں پولیس کی طرف سے ڈرانے دھمکانے اور ہراساں کرنے کے واقعات میں اضافہ ہوا۔ان کا کہنا تھا کہ پولیس بینظیر بھٹو کے قتل سے پیدا ہونے والی گڑبڑ کے بعد،جس میں لوٹ مار اور آتشزنی کے واقعات ہوئے،وارنٹ کے بغیر لوگوں کے گھروں میں داخل ہوجاتی تھی اور لاکھوں کارکنوں کے خلاف مقدمات درج کئے گئے۔

24 مارچ کو نئے منتخب وزیراعظم گیلانی نے سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس چوہدری افتخار کو گھر کی نظر بندی سے رہا کردیا۔وہ رہا ہونے والے ان 6,000 افراد میں سے آخری شخص تھے،جنھیں مشرف حکومت نے نومبر 2007 میں ہنگامی حالت کے دوران گرفتار کیا تھا۔

عورت فاؤنڈیشن کے مطابق 66 فیصد قیدی خواتین حدود قوانین کے تحت زنا کے جرم میں مقدمہ چلائے جانے کا انتظار کر رہی تھیں۔2006 میں تحفظ خواتین قانون کے نفاذ کے بعد خواتین کو حدود آرڈی ننس کے تحت زنا کے جرم میں گرفتار نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ان پر یہ لازم ہے کہ وہ زنا کے مجرم کے خلاف چار گواہ پیش کریں،جس کی ضرورت زنا کے قوانین میں ہے(غیر ازدواجی جنسی تعلقات سے متعلق قوانین)۔تاہم تحفظ خواتین قانون کسی عورت کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ ازدواجی آبروریزی یعنی نکاح کے بعد لیکن رخصتی سے پہلے شوہر کے ہاتھوں آبروریزی کیخلاف مقدمہ درج کرائے۔تحفظ خواتین ایکٹ کی منظوری کے بعد حکام نے 300 سے 500 تک خواتین کو جیلوں سے رہا کیا،کیونکہ قانون میں سزا میں نرمی کی گئی تھی۔جولائی 2007 میں صدر نے قانونی اصلاحات کا آرڈی ننس جاری کیا،جس سے حدود آرڈی ننس کے تحت قید خواتین کو ضمانت کا حق مل گیا۔

نیب کیسوں پر یا انسداد دہشت گردی عدالتوں میں لائے جانے کیسوں پر خصوصی قواعد کا اطلاق ہوتا ہے۔نیب کیسوں میں مشتبہ ملزمان بغیر فرد جرم کے 15 دن تک حراست میں رکھے جاسکتے ہیں(عدالت کی منظوری سے اس مدت میں توسیع ہوسکتی ہے)اور فرد جرم عائد کئے جانے سے پہلے انھیں وکیل سے مشورہ کرنے سے روکا جاسکتا ہے۔حکومت کے ان دعووں کے باوجود کہ نیب کیسوں کی پیروی کسی شخص کی سیاسی وابستگی سے بالاتر رہ کر کی جاتی ہے،اپوزیشن کے سیاستدانوں پر مقدمات چلائے جانے کا زیادہ امکان رہا۔نیب نے حاضر سروس فوجیوں اور عدلیہ کے ارکان پر کوئی مقدمہ نہیں چلایا۔

احتساب عدالتیں ضمانت نامنظور کرسکتی ہیں۔نیب کے چیئرمین کو یہ کُلی اختیار حاصل ہے کہ زیر حراست شخص کو رہا کیا جائے یا نہیں اور اگر رہا کیا جائے تو کب۔

انسداد دہشت گردی عدالتیں ایسی صورت میں ضمانت منظور نہیں کرتیں جب ان کے سامنے معقول وجوہات موجود ہوں کہ ملزم واقعی مجرم ہے۔

(Posted on March 31, 2009)

سیکورٹی فورسز عدالت کی منظوری کے بغیر مشتبہ دہشت گردوں کی سرگرمیوں کو محدود کرسکتی ہیں، ان کے اثاثے ضبط کرسکتی ہیں اور انھیں ایک سال تک بغیر فردجرم کے حراست میں رکھ سکتی ہیں۔

اکتوبر 2007 میں اس وقت کے صدر مشرف نے قومی مصالحت آرڈی ننس ''این آر او'' جاری کیا، جس کے تحت ایسے سیاستدانوں کو عام معافی دے دی گئی، جن پر 1986 اور 1999 کے درمیان سیاسی بنیادوں پر مقدمہ چلایا گیا، لیکن انھیں سزا نہیں سنائی گئی تھی۔ اس آرڈی ننس کو عدالت میں چیلنج کیا گیا اور سال کے آخر تک اپیل سپریم کورٹ میں زیرالتوا تھی۔ سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کے خلاف 23 مقدمات واپس لئے گئے۔

مارچ میں آصف علی زرداری کے خلاف باقی ماندہ کرپشن کے پانچ کیس بھی واپس لے لئے گئے، اور اگست میں اس کے خلاف سوئس عدالت میں دائر مقدمات بھی پاکستانی حکام کی درخواست پر ختم کردیئے گئے۔

13 مئی کو نئی حکومت نے اعلان کیا کہ اس نے سزائے موت معطل کردی ہے، لیکن حقیقتاً اس اعلان پر عمل نہیں کیا گیا۔ ہیومن رائٹس واچ کی رپورٹ کے مطابق جون میں جن 7,000 سے زیادہ قیدیوں کو سزائے موت سنائی جا چکی تھی، ان کی تعداد ملک میں سزا پانے والے قیدیوں کی ایک چوتھائی تعداد کے برابر تھی۔ مارچ میں پاکستان کے انسانی حقوق کمیشن نے بتایا کہ اس بات کے ٹھوس شواہد موجود ہیں کہ سزائے موت پر پوری قانونی کارروائی کے بغیر عمل کیا گیا۔

ر۔ منصفانہ مقدمات چلانے سے انکار

قانون کی رو سے آزاد عدلیہ کا قیام ضروری ہے، لیکن عملی طور پر عدلیہ تمام سطحوں پر انتظامیہ کے زیر اثر تھی۔ 2007 میں ہنگامی حالت کے نفاذ کے بعد یہ اثر اور بھی بڑھ گیا جب سپریم کورٹ اور صوبائی ہائی کورٹس کے ججوں کو برطرف کردیا گیا اور ان کی واپسی کیلئے یہ شرط عائد کردی گئی کہ وہ ہنگامی حالت کے نفاذ کے دوران جاری کئے گئے عبوری آئینی حکم کے تحت نیا حلف اٹھا سکتے ہیں۔

جون میں نئی منتخب حکومت نے سپریم کورٹ کے ججوں کی تعداد 16 سے بڑھا کر 29 کردی۔ اس وقت کے صدر اور چیف آف آرمی سٹاف پرویز مشرف نے نومبر 2007 میں سپریم کورٹ کے جن 13 ججوں کو برطرف کیا تھا، سال کے آخر تک ان میں سے 5 ججوں کو نئی حکومت نے نئی حلف برداری کے ذریعے بحال کردیا، 3 جج ریٹائر یا مستعفی ہوگئے جبکہ سابق چیف جسٹس افتخار چودھری سمیت 5 جج اپنے عہدوں سے الگ رہے۔ ان پانچ ججوں کا موقف تھا کہ نیا حلف اٹھانے سے سپریم کورٹ اور صوبائی ہائی کورٹس کے ججوں کو برطرف کرنے کے بارے میں مشرف کے اقدام کے جواز کی تصدیق ہو جائے گی۔ عبدالحمید ڈوگر، جنہوں نے نومبر 2007 میں مشرف کی طرف سے افتخار چودھری کو برطرف کئے جانے کے بعد چیف جسٹس کا عہدہ سنبھالا تھا، سال کے آخر تک سپریم کورٹ کے سربراہ کے طور پر برقرار رہے۔

ہائی کورٹس کے معزول کئے گئے 30 ججوں میں سے 17 کو نئی حلف برداری کے ذریعے بحال کردیا گیا، 2 کی تعیناتی سپریم کورٹ میں کی گئی، 3 معزول جج، سال کی آخر تک ریٹائر یا مستعفی ہوگئے جبکہ 8 جج عدالتوں سے الگ رہے۔ 2007 میں ہنگامی حالت کے نفاذ کے دوران حکومت نے اسلام آباد ہائی کورٹ کی قیام کی ضرورت پر زور دیا جو فروری میں قائم کردی گئی۔

فرسودہ عدالتی طریقہ کار، مقدمات نمٹانے کے کمزور نظاموں، مقدمات پر اٹھنے والے بھاری اخراجات اور قانون کی ناقص تعلیم کے باعث دیوانی اور فوجداری مقدمات پر فیصلے نہیں ہوئے۔ ان مسائل کی وجہ سے موثر دادرسی اور شنوائی کے حقوق کو نقصان پہنچا۔

(Posted on March 31, 2009)

ملک میں کئی عدالتی نظام رائج ہیں جن کا دائرہ اختیار ایک دوسرے سے متجاوز تھا اور بعض اوقات ان میں مقابلے کا رجحان پایا گیا۔ ان عدالتوں نظاموں میں فوجداری، دیوانی، شخصی، عائلی اور تجارتی مقدمات کے علاوہ فوجی اور انسداد دہشت گردی کی عدالتیں اور شریعت کورٹس شامل ہیں۔ آئین کے آرٹیکل 203 کی رو سے وفاقی شرعی عدالت کو اس بات کا جائزہ لینے اور فیصلہ کرنے کیلئے استعمال کیا جاتا ہے کہ کوئی قانون اسلامی فقہ سے متصادم نہ ہو۔ تحفظ خواتین بل کی منظوری سے اس بات کا امکان ختم نہیں ہوا کہ وفاقی شرعی عدالت اس سلسلے میں بعض معاملات کا جائزہ لے سکتی ہے۔ وفاقی شرعی عدالت حدود آرڈیننس کے دائرے میں آنے والے ایسے کسی بھی مقدمے میں استعمال کی جاسکتی ہے جو سیکولر قانون کے تحت زیر سماعت نہ لایا گیا ہو۔ ان میں قمار بازی، نشہ آور اشیاء رکھنا اور ان کا استعمال اور شادی کرنے کے بہانے جنسی تعلقات قائم کرنے کے مقدمات شامل ہیں۔

نومبر، 2007 میں اس وقت کے صدر اور چیف آف آرمی سٹاف مشرف نے فوجی ایکٹ مجریہ 1952 میں ترمیم کے آرڈیننس پر دستخط کئے جس کے تحت خصوصی فوجی عدالتوں میں سویلین افراد پر مقدمہ چلایا جاسکتا تھا۔ عملی طور پر اس آرڈیننس کا اطلاق نہیں کیا گیا۔ ہیومن رائٹس واچ نے یہ بات نوٹ کی کہ اس قانون کی رو سے مقدمات کی سماعت بند کمرے میں کی جائے گی، تحقیقات فوجی افسر کریں گے اور ان مقدمات کے تصفیئے میں شواہد کے اصول اور فوجداری مقدمات کے طریقہ کار کو ملحوظ نہیں رکھا جائے گا۔ سابق حکومت کا دعوی تھا کہ یہ ترمیم دہشت گردوں کے خلاف مقدمات چلانے کیلئے کی گئی ہے۔ انسانی حقوق کی کئی تنظیموں نے اس ترمیم پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کے باعث گڑبڑ پیدا کرنے والوں سے لیکر قتل کے جرائم میں ملوث افراد تک کے لوگوں کو سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

2007 کی ہنگامی حالت کے دوران لیگل پریکٹیشنر اینڈ بار کونسلز ایکٹ مجریہ 1973 میں ترمیم کی وجہ سے سیاسی اثر ورسوخ کے بغیر موکلوں کی نمائندگی کرنے کی وکلا کی صلاحیت متاثر ہوئی۔ ہیومن رائٹس واچ کے مطابق اس ایکٹ سے وکلا تنظیموں کی آزادی محدود ہو کر رہ گئی اور حکومت کو ان وکلا پر پابندی عائد کرنے کے اختیارات حاصل ہو گئے جو حکومت مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہوں۔

ماتحت عدالتوں میں رشوت ستانی اور ناقص کارکردگی کے علاوہ مقدمات کا فیصلہ اپنے حق میں کرانے کیلئے دولت مند لوگوں اور مذہبی اور سیاسی شخصیات کے دباؤ کا سلسلہ جاری رہا۔ سیاسی بنیاد پر عدالتی ترقیوں کی وجہ سے ملک کے عدالتی نظام پر حکومت کے کنٹرول میں اضافہ ہوا۔ ججوں کی خالی آسامیاں پر نہ ہونے اور ناقص عدالتی طریقہ کار کے باعث نچلی عدالتوں اور اپیلٹ کورٹس میں بے شمار مقدمات تصفیہ طلب رہے۔

نچلی اور اعلی عدالتوں میں لاتعداد مقدمات پر فیصلے نہیں ہوئے تھے۔ نومبر میں سندھ کی ضلعی اور سیشن عدالتوں میں تصفیہ طلب مقدمات کی تعداد 120,000 تھی، ستمبر میں پشاور ہائی کورٹ کے 13,000 مقدمات تصفیہ طلب تھے جبکہ سپریم کورٹ کے ایسے مقدمات کی تعداد 16,596 تھی جن پر فیصلہ صادر نہیں کیا گیا تھا۔

سندھ اور پنجاب کے جاگیرداروں اور سرحد اور بلوچستان کے قبائلی سرداروں نے مروجہ قانونی نظام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مقامی کونسلوں (جنھیں پنچائت یا جرگہ کہا جاتا ہے) کے اجلاسوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ ایسی کونسلوں میں، جو خاص طور پر دیہات میں قائم ہیں، طویل خاندانی دشمنیاں ختم کرائی گئیں اور مجرم قرار دیئے گئے افراد کو قبائلی سزائیں سنائی گئیں جن میں جرمانے، قید و بند حتی کہ موت کی سزائیں شامل ہیں۔ پشتونوں کے علاقوں میں ایسی کونسلوں کے اجلاس پشتون قبائلی ضابطہ اخلاق کے تحت ہوتے ہیں۔ اس ضابطے کے مطابق کسی شخص، اس کے خاندان اور اس کے قبیلے کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنی غیرت اور عزت کی بحالی کیلئے اصلی یا تصور کئے گئے مجرم سے انتقام لے۔

قبائلی علاقوں میں خاندانی دشمنی کے سلسلے کو ختم کرنے خاص طور پر قتل کے معاملات طے کرانے کے روائتی طریقے کے مطابق ملزم کی بیٹیوں کی

(Posted on March 31, 2009)

شادیاں سوگوار خاندان کے مردوں سے کرادی جاتی ہیں۔

بہت سی قبائلی کونسلوں نے سزائے موت اور وٹے سٹے کی شادیوں جیسی سخت سزائیں سنائیں۔ پچھلے چند برس کے دوران ان اطلاعات میں اضافہ ہوا کہ کئی قبائلی ایجنسیوں اور سوات میں عسکریت پسندوں نے اپنی عدالتیں قائم کر رکھی ہیں جہاں کسی عدالتی کارروائی یا شفاف طریقہ کار کے بغیر مقدمات کا فیصلہ فوری طور پر کر دیا جاتا ہے۔

اے ایچ آر سی کی رپورٹ کے مطابق 2002 کے بعد ملک میں جرگہ عدالتوں کے فیصلوں کے ذریعے 4,000 افراد کو، جن میں دو تہائی خواتین تھیں، ہلاک کیا گیا۔ اگرچہ اعلیٰ عدالتوں نے ان فیصلوں کو غیر قانونی قرار دیا ہے لیکن اے ایچ آر سی کی اطلاع کے مطابق ان جرگوں کا انعقاد کرنے والے بعض افراد پارلیمنٹ کے رکن ہیں۔

عدالتی طریقہ کار

دیوانی، فوجداری اور عائلی عدالتوں میں کھلے عام مقدمہ چلایا جاتا ہے، ملزم کو بے گناہ تصور کیا جاتا ہے، وکیل جرح کرتے ہیں اور سزا کے خلاف اپیل دائر کی جا سکتی ہے۔ ملک میں جیوری سسٹم رائج نہیں ہے۔ ججوں کی کم تعداد، بڑی تعداد میں تصفیہ طلب مقدمات، طویل عدالتی طریقہ کار، فیصلوں میں بار بار التواء اور سیاسی دباؤ کے باعث مقدمات پر فیصلوں میں عموماً کئی برس لگ جاتے ہیں اور مدعا علیہان کو بار بار عدالتوں میں پیش ہونا پڑتا ہے۔ وکیل تبدیل ہونے پر مقدمہ از سر نو شروع ہو جاتا ہے

انسداد دہشت گردی ایکٹ کے تحت حکومت، پرتشدد جرائم، دہشت گردانہ سرگرمیوں، مذہبی منافرت پھیلانے کی غرض سے کئے جانے والے اقدامات یا تقاریر یا مملکت کے خلاف جرائم پر مقدمات خصوصی عدالتوں میں چلا سکتی ہے۔ ان عدالتوں میں پیش ہونے والے مقدمات کا فیصلہ سات دن میں کیا جانا ضروری ہے لیکن جج اپنی مرضی کے مطابق مقدمات کو طول دینے میں آزاد ہیں۔ معمول کے طریقہ کار کے مطابق ہائی کورٹوں اور سپریم کورٹ نے ان عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف اپیلوں کی سماعت کی۔ انسانی حقوق کے علمبرداروں نے فوری فیصلہ کرنے والے اس متوازی نظام پر نکتہ چینی کرتے ہوئے الزام لگایا کہ سیاسی مقاصد کے حصول کیلئے اس نظام کا بھرپور استعمال کیا گیا ہے۔

عدالتیں عام طور پر اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کرنے میں ناکام رہیں۔ ججوں پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ مبنی مسلک کے لوگوں کے خلاف تصور کئے گئے کسی بھی جرم پر سخت کارروائی کریں۔ عدلیہ نے مذہبی اقلیتوں سے امتیاز روا رکھنے کے مقدمات کی بہت کم شنوائی کی۔

عیسائیوں، احمدیوں اور مسلمانوں سمیت دیگر مذہبی گروپوں کے خلاف توہین رسالت قوانین کا استعمال کیا جاتا رہا۔ ایسے مقدمات کا فیصلہ کرنے کیلئے اکثر و بیشتر نچلی عدالتوں کو کافی شواہد کی ضرورت نہیں ہوتی اور اعلیٰ عدالتوں کی جانب سے ایسے فیصلوں کو منسوخ کرنے یا بعض ملزموں اور سزا یافتہ افراد کی رہائی کے احکامات صادر کرنے سے پہلے انہیں کئی برس تک جیل میں رہنا پڑتا ہے۔

بنیادی عدالتوں نے عام طور پر توہین رسالت کے مقدمات میں ضمانت منظور نہیں کی۔ ان کا دعویٰ تھا کیونکہ مدعا علیہان کو سزائے موت کا سامنا ہوتا ہے اس لئے وہ ملک سے فرار ہو سکتے ہیں۔ بہت سے مدعا علیہان نے ضمانت منظور نہ ہونے کے خلاف اپیل کی جو اکثر مسترد کر دی گئی۔ جن نچلی عدالتوں نے فیصلوں میں تاخیر کی انہیں ڈرایا دھمکایا گیا اور انہوں نے انتہا پسند عناصر کی کارروائیوں کے خدشے کے پیش نظر ضمانتیں منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

(Posted on March 31, 2009)

وفاقی شرعی عدالت ان تمام حدود کیسز میں پہلی اپیل کی عدالت ہے جن میں دو برس سے زیادہ قید کی سزا سنائی گئی ہو۔ تاہم سپریم کورٹ نے یہ حکم جاری کیا ہے کہ اگر ہائی کورٹس کسی حدود کیس میں اپیل کی غلطی سے سماعت کرتی ہیں تو وفاقی شرعی عدالت کو ان کے فیصلوں کا جائزہ لینے کا اختیار نہیں ہے۔

سپریم کورٹ کا شریعت بنچ، وفاقی شرعی عدالت کے مقدمات میں اپیل کی آخری عدالت ہے۔ 2005 میں ایک حکم کے ذریعے سپریم کورٹ کے پورے بنچ کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ ایسے اپیلٹ کیسز میں شریعت بنچ کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کی سماعت خود کر سکتا ہے۔ اگر وفاقی شرعی عدالت کسی قانون کو اسلامی شریعت سے متصادم تصور کرتی ہے تو اسے اس قانون کو منسوخ کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ تاہم ایسے کیسز میں سپریم کورٹ کے شریعت بنچ میں اپیل کی جا سکتی ہے اور اس کی سماعت سپریم کورٹ کا پورا بنچ کرتا ہے۔

وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقوں (فاٹا) کا الگ قانونی نظام ایف سی آر، اجتماعی ذمہ داری کے اصول کو تسلیم کرتا ہے۔

قبائلی عمائدین فاٹا میں عدل و انصاف کے ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے مقدمات کی سماعت اسلامی قانون اور قبائلی رسم و رواج کے مطابق کی۔ ملزم کو قانونی نمائندگی، ضمانت یا اپیل کا کوئی حق حاصل نہیں۔ عام سزائیں جرمانوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ قبائلی علاقوں میں تعینات وفاقی سول ملازمین ان کارروائیوں کی نگرانی کرتے ہیں اور وہ 14 سال تک قید کی سزا سنا سکتے ہیں۔ ایف سی آر کے تحت، فاٹا کے مکین، ان فیصلوں کے خلاف سول بیوروکریسی میں ہی اپیل کر سکتے ہیں۔ بعض مبصروں نے اس طریقہ کار کو ناقص قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ ان مقدمات میں اپیلوں کی سماعت عدلیہ میں کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

انسانی حقوق کی غیر سرکاری تنظیموں نے بھی اجتماعی ذمہ داری کے تصور کے بارے میں تشویش کا اظہار کیا ہے کیونکہ حکام نے اسے مفرور ملزمان کے قبائل کے لوگوں کو گرفتار کرنے، ان کے گھر مسمار کرنے، ان کی املاک ضبط یا تباہ کرنے یا مفروروں کے دیہات کا اس وقت تک محاصرہ کرنے کیلئے استعمال کیا جب تک انہوں نے خود کو حکام کے حوالے نہ کر دیا یا ان کے قبائل نے انہیں مقامی روایات کے مطابق سزا نہ دے دی۔

سال کے دوران فاٹا میں مذہبی انتہا پسندوں اور عسکریت پسندوں کی طرف سے انصاف کے نظام سمیت متوازی انتظامیہ قائم کرنے کی اطلاعات میں اضافہ ہوا۔ سرعام پھانسی دینا اس رجحان کا واضح اظہار ہے۔

صوبہ سرحد کے زیر انتظام قبائلی علاقے، جن میں سوات، دیر اور چترال کی سابق ریاستیں شامل ہیں، نظام عدل قانون مجریہ 1999 (جسے عام طور پر قانون شریعت کہا جاتا ہے) کے دائرہ کار میں آتے ہیں۔ اس قانون کے تحت مذہبی علماء ججوں کی مدد کرتے ہیں، جنھیں قاضی کہا جاتا ہے۔

آزاد کشمیر میں ملکی عدلیہ سے الگ ایک عدالتی نظام قائم ہے۔

شمالی علاقوں میں بھی منفرد عدالتی نظام قائم ہے۔ آئی سی جی نے 2007 کی رپورٹ میں یہ بات نوٹ کی ہے کہ شمالی علاقوں میں عدالتی ادارے، وفاق کی طرف سے مقرر کردہ چیف ایگزیکٹو کے ماتحت ہیں جو علاقے کے خصوصی انتظامی ڈھانچے کا سربراہ ہے۔ شمالی علاقوں میں ملکی قوانین کا نفاذ، شمالی علاقوں اور امور کشمیر کی وزارت کی صوابدید پر کیا جاتا ہے۔ شمالی علاقوں کی چیف کورٹ کو ہائی کورٹ کے تمام اختیارات حاصل نہیں ہیں۔ تاہم 1999 میں سپریم کورٹ کے ایک حکم کے بعد 2005 میں ایک کورٹ آف اپیلز قائم کی گئی۔

سیاسی قیدی اور زیر حراست افراد

(Posted on March 31, 2009)

بعض سیاسی گروپوں نے دعوی کیا کہ ان کے ارکان کو سیاسی وابستگی یا عقائد کی بنیاد پر گرفتار کرلیا گیا۔

بلوچ قوم پرست سیاسی لیڈروں اور انسانی حقوق کی تنظیموں کے مطابق فوجی انٹیلی جنس اداروں اور سیکورٹی فورسز نے 2004 میں شروع ہونے والی فوجی کارروائی میں صوبے میں ایک ہزار سے پندرہ سو بلوچ سیاسی کارکنوں کو گرفتار کرلیا۔ گرفتار شدگان کی صحیح تعداد دستیاب نہیں کیونکہ ان میں سے بیشتر سے کسی کو ملنے نہیں دیا گیا۔ حکومت نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ لاپتہ ہونے والے افراد میں سے گیارہ سو اس کی حراست میں ہیں اور خیال ہے کہ سینکڑوں سندھی اور بلوچ قوم پرست لیڈر اور کارکن ان میں شامل تھے (سیکشن ا۔ب دیکھئے)

اے ایچ سی آر کی رپورٹ کے مطابق 2 فروری کو پنجاب کے ایک صوبائی وزیر نے مبینہ طور پر لاہور میں کسی گروپ کے چھ طالبعلموں کارکنوں اور اساتذہ پر حملہ کرنے، انہیں گرفتار کرنے اور حراست میں رکھنے کا حکم دیا۔ یہ افراد اس وقت سپریم کورٹ بار کونسل کے صدر اعتزاز احسن کی رہائی کا جشن منانے کیلئے ایک تقریب کا اہتمام کررہے تھے۔ اطلاعات کے مطابق پولیس نے وزیر یا اسکے ماتحت افراد کے خلاف کوئی ایف آئی آر درج نہیں کی اور شہر کے میئر نے مبینہ طور پر وزیر کی اس کارروائی کا دفاع کیا۔

28 مئی کو کراچی میں سادہ کپڑوں میں ملبوس سیکورٹی کے اہلکاروں نے بلوچ نیشنلسٹ فرنٹ کے لیڈر غلام محمد بلوچ کو اس وقت گرفتار کرلیا جب انہوں نے ملک کے ایٹمی تجربات کے خلاف مظاہرے کی قیادت کی۔ اخباری اطلاعات کے مطابق پولیس نے کراچی میں اشتعال انگیز تقریر کرنے پر ان کے خلاف ایف آئی آر درج کرلی۔ انہیں اس سے پہلے مئی 2006ء میں لاپتہ کردیا گیا تھا اور مبینہ طور پر دوران حراست ان پر تشدد کیا گیا اور انہیں کسی سے ملنے نہیں دیا گیا۔ سال کے آخر میں حکام نے انہیں رہا کردیا۔

23 فروری کو حکام نے منیر مینگل کو رہا کردیا جنہیں بلوچ سیٹلائٹ ٹیلی ویژن سٹیشن قائم کرنے کی کوشش میں 22 ماہ پہلے حراست میں لیا گیا تھا۔ سال کے آخر میں وہ ملک سے فرار ہوگئے۔ دسمبر میں انہوں نے Reporters Without Borders نامی تنظیم کو بتایا کہ حراست کے دوران فوجی انٹیلی جنس کے اہلکاروں نے ان پر تشدد کیا اور انہیں نیند سے محروم رکھا گیا۔

9 مئی کو سندھ کی انسداد دہشت گردی عدالت نے بلوچ قوم پرست رہنما سردار اختر مینگل کی رہائی کا حکم جاری دیا۔ انھیں نومبر 2006 میں گرفتار کیا گیا تھا کیونکہ وہ اگست 2006ء میں فوج کے ہاتھوں نواب اکبر خان بگٹی کی ہلاکت کے خلاف احتجاج کیلئے چند دن بعد بلوچستان بھر میں مارچ کرنے والے تھے۔ دسمبر 2006ء میں کراچی کی ایک انسداد دہشت گردی عدالت نے اختر مینگل پر الزام عائد کیا کہ انہوں نے اپریل 2006ء میں فوجی انٹیلی جنس کے دو اہلکاروں کو مبینہ طور پر اغوا کرایا تھا۔ ایچ آر سی پی نے بتایا کہ تنظیم کو، اختر مینگل کی حراست اور انہیں ان کے اہلخانہ سے ملنے کی اجازت نہ دینے کے خلاف احتجاج کی وجہ سے ان کے مقدمے کی کارروائی سننے سے منع کردیا گیا۔

دیوانی عدالتی طریقہ کار اور دادرسی

لوگ، انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر دادرسی کیلئے ہائیکورٹ میں عرضداشت پیشکش کرسکتے ہیں اور عدالتیں اکثر و بیشتر اس سلسلے میں کارروائی کرتی ہیں۔ افراد، سول عدالتوں میں انسانی حقوق کی فراہمی سے انکار سمیت سرکاری عہدیداروں کے خلاف شکایات کیلئے سول عدالتوں سے رجوع کرسکتے ہیں۔ تاہم، مبصرین کی اطلاع کے مطابق سول عدالتوں نے ایسے کیسز میں شاذ و نادر فیصلے جاری کئے اور بیشتر کیسز عدالت کے باہر طے کر لئے گئے۔ اگرچہ ایسے معاملات طے کرنے کا کوئی انتظامی طریقہ کار موجود نہیں ہے لیکن عموماً یہ معاملات غیر رسمی طور پر یہ معاملات طے کرلیے گئے۔

(Posted on March 31, 2009)

س۔لوگوں کی پرائیویسی، ان کے خاندانی اور گھریلو امور یا ان کی مراسلت میں من مانی مداخلت

قانون کی رو سے عدالتوں نے افراد کی نہیں بلکہ املاک کی تلاش کے وارنٹ جاری کیے۔ پولیس نے عام طور پر ان کی پابندی نہیں کی اور تلاشی کے دوران وہ گھروں سے کئی چیزیں اٹھا کر لے گئے۔ غیر قانونی طریقے سے گھروں میں داخل ہونے پر پولیس کے خلاف بہت کم کارروائی کی گئی۔ انسداد دہشت گردی ایکٹ کے تحت چلائے جانے والے بعض مقدمات میں سیکورٹی فورسز کو کسی وارنٹ کے بغیر املاک کی تلاشی لینے اور ضبط کرنے کی اجازت دی گئی۔

حکومت نے ملک میں کئی انٹیلی جنس ادارے برقرار رکھے جنہوں نے سیاستدانوں، سیاسی سرگرمیوں، مشتبہ دہشت گردوں، ذرائع ابلاغ اور مشتبہ غیر ملکی انٹیلی جنس ایجنٹوں پر نگاہ رکھی۔ ان اداروں میں آئی ایس آئی، انٹیلی جنس بیورو، پولیس سپیشل برانچ اور ملٹری انٹیلی جنس شامل ہیں۔ مصدقہ اطلاعات سے ظاہر ہوا ہے کہ سپریم کورٹ کے حکم کے باوجود، حکام نے عدالت کی منظوری کے بغیر فون پر لوگوں کی گفتگو ریکارڈ کی اور ڈاک کی جانچ پڑتال کی۔ اس بات کا بھی شبہ پایا گیا کہ لوگوں کی موبائل فون کالوں اور الیکٹرانک مراسلت پر نگاہ رکھی جاتی ہے۔

انسداد دہشت گردی ایکٹ مجریہ 1997 کی رو سے حکومت نے کئی انتہا پسند مذہبی اور دہشت گرد گروپوں کی سرگرمیوں اور ان کی رکنیت سازی پر پابندی عائد کر دی۔ کچھ کالعدم گروپوں نے اپنے نام تبدیل کر لئے اور وہ سرگرم رہے۔ ان میں جیش محمد (نیا نام: تحریک فرقان اور الرحمت ٹرسٹ)؛ تحریک جعفریہ پاکستان (نیا نام: تحریک اسلامی پاکستان) اور سپاہ صحابہ پاکستان (نیا نام: ملت اسلامیہ پاکستان) شامل ہیں۔ لشکر طیبہ نے جماعت دعوہ کے نام سے اپنی دوبارہ تنظیم نو کی لیکن دسمبر میں اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قرارداد 1267 کے تحت اسے غیر ملکی دہشت گرد تنظیم قرار دیئے جانے کے بعد اس پر پھر پابندی لگا دی گئی۔ 25 اگست کو حکومت تحریک طالبان پاکستان (TTP) کو دہشت گرد تنظیم قرار دے دیا اور سٹیٹ بنک کو حکم دیا کے اس کے تمام کھاتے منجمد کر دیئے جائیں۔ TTP عسکریت پسندوں کے کئی گروپوں پر مشتمل ایک تنظیم ہے جو بیت اللہ مسعود نے دسمبر 2007 میں قائم کی تھی۔

اگرچہ حکومت نے عام طور پر لوگوں کے شادی کرنے کے حق میں مداخلت نہیں کی لیکن بعض مواقع پر مقامی حکام نے شادیاں رکوانے میں ان بااثر خاندانوں کی مدد کی جو ان شادیوں کے خلاف تھے۔ حکومت نے ایسے مقدمات کی بھی سرگرمی سے پیروی نہیں کی جن میں خاندان کے لوگوں نے خاندان کی مرضی کے خلاف شادی کرنے یا طلاق دینے والوں (ان میں زیادہ تر خواتین تھیں) کو سزائیں دیں۔ اسلام قبول کرنے والی خواتین کی شادیاں، جو سابقہ مذہبی رسوم کے مطابق انجام پائی تھیں، منسوخ تصور کی گئیں لیکن اسلامی مذہب اختیار کرنے والے مردوں کی شادیاں برقرار رکھی گئیں۔

بعض معاملات میں حکام نے کسی شخص کو گرفتاری دینے پر مجبور کرنے کیلئے اس کے رشتہ داروں کو حراست میں لے لیا۔ غیر سرکاری تنظیموں نے الزام لگایا کہ انٹیلی جنس اہلکاروں نے بلوچ قوم پرستوں کے اہل خانہ کو بار بار ہراساں کیا۔ فاٹا میں ایف سی آر کے تحت اجتماعی سزا کا طریقہ استعمال کیا گیا جس کے مطابق رشتہ داروں یا ایک ہی قبیلے کے ارکان کو حراست میں لے لیا گیا۔

اے ایچ آر سی کے مطابق 24 نومبر کو سندھ میں پولیس نے ایک شخص کی گرفتاری کیلئے اس کی آٹھ رشتہ دار خواتین اور چار بچوں کو حراست میں لے لیا۔ 23 دسمبر کو سندھ ہائی کورٹ کے ایک بنچ نے اس کیس کے بارے میں ایک آئینی عرضداشت ملتوی کر دی۔

ش۔داخلی تنازعات میں طاقت کا وحشیانہ استعمال اور دیگر استحصال

زیر نظر سال کے دوران ملک بھر میں سلامتی کی صورتحال خراب رہی کیونکہ غیر ملکی القاعدہ، افغان طالبان، تحریک طالبان پاکستان اور مقامی انتہا

(Posted on March 31, 2009)

پسند گروپوں نے سویلین افراد اور سیکیورٹی فورسز پر حملے کئے۔حکومت نے خاص طور پر صوبہ سرحد کے علاقے سوات اور فاٹا کی ایجنسیوں باجوڑ اور مہمند میں کئی طرح کی فوجی کارروائیاں کیں جن میں فضائی بمباری اور زمینی فوج کا استعمال شامل تھی۔آزاد مبصرین کے اندازے کے مطابق صوبہ سرحد اور فاٹا میں فوجی کارروائیوں کے باعث تقریباً 1,150 افراد ہلاک ہوئے۔65 سے زائد خودکش حملوں سمیت 200 دہشت گردانہ حملے ہوئے جن میں ایک اندازے کے مطابق 970 سویلین افراد اور سیکیورٹی اہلکار ہلاک ہوئے۔

سیکیورٹی کی ناقص صورتحال، سیکیورٹی فورسز اور عسکریت پسندوں کے ڈرانے دھمکانے اور فاٹا میں ان افراد کی، جو وہاں کے رہنے والے نہیں ہیں، رسائی پر حکومت اور سیکیورٹی فورسز کے کنٹرول کی وجہ سے انسانی حقوق کی تنظیموں اور صحافیوں کیلئے فوجی کارروائیوں کے دوران لوگوں کے استحصال کے بارے میں رپورٹنگ کرنا مشکل ہوگیا۔

کئی ذرائع نے اطلاع دی کہ فاٹا اور سوات میں سیکیورٹی فورسز کی طرف سے زمینی توپخانے کے استعمال اور فضائی بمباری کے نتیجے میں سویلین افراد کا خاصا جانی اور مالی نقصان ہوا۔عسکریت پسندوں نے جرمانے عائد کئے اور سرعام لوگوں کے سر قلم کئے، لاشیں سرعام لٹکائیں، سنگسار کیا اور کوڑے مارے۔

اخباری اطلاعات کے مطابق فاٹا کی کرم ایجنسی میں زیادہ تر اگست اور 16 اکتوبر کو امن معاہدہ طے پانے کے درمیانی عرصے میں سنی۔شیعہ فسادات کے دوران تقریباً 700 افراد کو ہلاک کیا گیا۔ایچ آر سی پی نے یہ بات نوٹ کی کہ بعض لاشوں کے ٹکڑے کر دیئے گئے اور انہیں سڑک کنارے چھوڑ دیا گیا جبکہ حملوں کے دوران ایمبولنسوں کو نشانہ بنایا گیا۔

غیر سرکاری تنظیموں اور ذرائع ابلاغ کی اطلاعات میں بتایا گیا کہ بلوچستان میں کم سطح کی شورش جاری رہی جس کے نتیجے میں سال کے شروع سے نومبر کے آخر تک کم از کم 800 سو عسکریت پسند، 125 سویلین افراد اور سیکیورٹی فورسز کے 91 اہلکار ہلاک ہوئے۔اے ایچ سی آر کے مطابق صرف جولائی اور اگست میں 100 سے زائد افراد ہلاک اور 20,000 سے زیادہ بے گھر ہوئے۔اس سے پہلے کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 2006 کے دوران 158 ہلاکتیں ہوئیں۔

ہلاکتیں

29 مئی کو ایچ آر سی پی نے یہ بات نوٹ کی کہ سیکیورٹی فورسز نے غیر جنگجو افراد کو نشانہ بنایا اور انہیں ہلاک کر دیا اور اس وقت تک ان واقعات کی کوئی تحقیقات نہیں کرائی گئی۔

23 ستمبر کو سیکیورٹی فورسز نے سوات میں سویلین افراد کے ایک مجمع پر فائرنگ کی جو اسی دن سیکیورٹی فورسز کے ہاتھوں ایک عورت اور دو بچوں کے ہلاکت کے خلاف احتجاج کیلئے جمع ہوئے تھے۔فائرنگ سے 5 افراد ہلاک ہوگئے۔

سال کے دوران عسکریت پسندوں نے فاٹا، صوبہ سرحد اور ملک کے باقی حصوں میں خودکش حملے کئے۔سب سے زیادہ ہلاکت خیز حملوں میں 4 مارچ کو فاٹا کے علاقے درہ آدم خیل میں ایک امن جرگے کے دوران حملہ کیا گیا جس میں عسکریت پسندوں کے مخالف 43 قبائلی عمائدین ہلاک ہوگئے، 21 اگست کو پنجاب میں واہ چھاؤنی کے علاقے میں آرڈیننس فیکٹری کے باہر خودکش حملے میں 60 افراد مارے گئے، 20 ستمبر کو میریٹ ہوٹل اسلام آباد پر خودکش حملے میں 53 افراد ہلاک ہوئے، 2 اکتوبر کو چارسدہ میں اے این پی کے صدر اسفندیار ولی خان پر خودکش حملے میں چار افراد مارے گئے لیکن اسفند

(Posted on March 31, 2009)

یارولی خان محفوظ رہے اور 10 اکتوبر کو اورکزئی ایجنسی کے علاقے انجمن میں ایسے ایک حملے میں 100 سے زیادہ افراد ہلاک ہو گئے۔

دیگر حملوں میں 5 دسمبر کو پشاور میں بم دھماکا ہوا جس میں کم از کم 22 افراد ہلاک اور 90 سے زائد زخمی ہو گئے، 7 جولائی کو لال مسجد کارروائی کو ایک سال مکمل ہونے پر اسلام آباد میں خودکش حملہ کیا گیا جس میں 18 پولیس اہلکار ہلاک ہو گئے، 4 مارچ کو لاہور نیول اکیڈمی پر بم دھماکے میں 8 افراد مارے گئے اور جنوبی پنجاب کے شہر بہاولپور کے قریب ٹرین میں بم دھماکے سے 6 افراد ہلاک ہو گئے۔

فاٹا اور صوبہ سرحد کے کچھ حصوں میں سیکیورٹی کے صورتحال خاصی خراب ہو گئی۔ سال کے دوران مقامی طالبان اور ان کی عدالتوں نے کئی سویلین افراد اور سیکورٹی اہلکاروں کے سر قلم کئے۔ 28 اپریل کو جنوبی وزیرستان میں ایک پولیس اہلکار کا سر، مبینہ طور پر سیکورٹی فورسز کیلئے جاسوسی کرنے کے الزام میں قلم کر دیا گیا، 14 اگست کو میران شاہ میں ایک سرکاری اہلکار کا سر کاٹ دیا گیا، 20 اگست کو پشاور سے لے جانے والی دو مبینہ طوائفوں کو ہلاک کر دیا گیا اور 8 ستمبر کو دو اور مبینہ طوائفوں کو پشاور کی قریب ہلاک کر کے ان کی لاشیں دفنا دی گئیں۔

فاٹا کی کرم ایجنسی میں کئی فرقہ وارانہ ہلاکتیں ہوئیں۔ اس سلسلے میں نمایاں حملوں میں 19 جون کو 11 ٹرک ڈرائیوروں کے سر قلم کر کے ان کے اعضاء کاٹ دیئے گئے۔ ان افراد کو اس وقت اغواء کیا گیا جب وہ پارہ چنار میں، جس کی اکثریتی آبادی شیعہ ہے، امدادی سامان پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے اور 19 اگست کو مقامی طالبان نے صوبہ سرحد کے شہر ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک ہسپتال کے ایمرجنسی وارڈ کے قریب حملہ کر کے ان 32 افراد کو ہلاک کر دیا جو ایک شیعہ لیڈر کی ہلاکت پر تعزیت کیلئے جمع تھے۔

سال کے آخر میں ایک ممتاز اور محترم دیوبندی عالم دین مولانا حسن جان کے قتل کا مقدمہ جاری رہا۔ انہوں نے خودکش حملوں کو غیر اسلامی قرار دیا تھا جس پر انہیں ستمبر 2007 میں ہلاک کر دیا گیا تھا۔ پولیس نے ستمبر 2007 کو 31 مشتبہ افراد کو گرفتار کر لیا۔ تاہم اس مقدمے میں مزید پیش رفت نہیں ہوئی۔

سال کے آخر میں ایک کالعدم سنی۔ دیوبندی عسکریت پسند تنظیم لشکر جھنگوی کے تین ارکان پر 2006 ہنگو میں عاشورہ محرم کے سلسلے میں ایک شیعہ اجتماع خودکش حملہ کرانے کے الزام میں مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ اس بم دھماکے میں 29 افراد اور 50 سے زائد زخمی ہو گئے تھے۔

بلوچستان میں سیکیورٹی کی صورتحال غیر مستحکم رہی۔ صوبے میں ڈیرہ بگٹی، کوہلو، نوشکی، سوئی اور دیگر علاقوں میں بارودی سرنگوں کے دھماکوں میں بچوں سمیت کئی افراد ہلاک ہو گئے۔

30 مارچ کو سیکورٹی فورسز نے مبینہ طور پر لانگو اور سگاری میں گن شپ ہیلی کاپٹر اور بھاری توپخانے کی مدد سے کارروائی کی۔ اخباری اطلاعات کے مطابق اس کارروائی میں چار خواتین اور 12 بچے ہلاک ہو گئے۔

اے ایچ آر سی کے مطابق 5 اپریل کو فوجی افسروں نے مبینہ طور پر ضلع ڈیرہ بگٹی میں 4 افراد کو گرفتار کر لیا کمیٹی کے دعویٰ کے مطابق ان افراد سے اقبال جرم کرانے کیلئے انہیں گرم کول تار میں ڈال دیا گیا۔ اطلاعات کے مطابق ان میں 3 افراد فوری طور پر ہلاک ہو گئے جبکہ چوتھا شخص جعفر کھوسہ سات دن بعد حراست میں ہلاک ہو گیا۔

14 جون کو کوئٹہ میں نامعلوم مسلح افراد نے ایک وین پر فائرنگ کر کے سات فوجیوں، ایک پولیس کانسٹیبل اور ایک راہگیر کو ہلاک کر دیا۔ مسلح افراد نے موٹر سائیکل پر سوار دو پولیس اہلکاروں پر بھی فائرنگ کی۔ ان میں سے ایک زخموں کے تاب نہ لاتے ہوئے دم توڑ گیا جبکہ دوسرا شدید زخمی تھا۔ ستمبر میں پولیس نے اس سلسلے میں تین افراد کو گرفتار کر لیا جن میں مبینہ طور پر بلوچستان لبریشن آرمی کے دو ارکان بھی شامل تھے۔

(Posted on March 31, 2009)

بلوچ ویب سائٹس کے مطابق 25 اگست کو تربت بلوچستان میں فرنٹیئر کور کے اہلکاروں نے مبینہ طور پر ایک عام شہری الطاف بلیدی کو اس وقت ہلاک کر دیا جب انہوں نواب اکبر بگٹی کی دوسری برسی کے موقع پر مظاہرہ کرنے والے ایک نہتے ہجوم پر فائرنگ شروع کر دی۔ زخمی ہونے والوں میں چار صحافی شامل تھے۔ ان میں دو فائرنگ اور دو آنسو گیس کے گولے لگنے سے زخمی ہوئے۔

سال کے آخر تک بلوچ لیڈر نواب خیر بخش مری کے صاحبزادے میر بالاچ مری کی دسمبر 2007 میں ہلاکت کے کیس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ آیا انہیں ملک میں ہلاک کیا گیا تھا یا افغانستان میں۔

سال کے دوران حکام نے 2006 میں بلوچ قوم پرست لیڈر نواب اکبر بگٹی کی ہلاکت کے واقعے کی سرکاری تحقیقات نہیں کرائی۔ اس واقعے میں نواب بگٹی، ان کے 35 ساتھی اور پانچ فوجی اہلکار ہلاک ہو گئے تھے۔ ذرائع ابلاغ کے اطلاعات کے مطابق نواب بگٹی اور ان کے ساتھی فضائیہ کی بمباری سے ہلاک ہوئے تھے۔

اغواء کی وارداتیں

جرائم پیشہ گروپوں نے، جن میں سے بعض کے رابطے عسکریت پسندوں سے تھے، بھتہ وصول کرنے، رقم بٹورنے اور اغوا کی سرگرمیوں کا دائرہ ملک بھر میں پھیلا دیا تھا۔ انہوں نے اس سلسلے میں سفارتکاروں، غیر ملکی باشندوں، مذہبی اقلیتیوں اور غیر سرکاری تنظیموں کے کارکنوں کو نشانہ بنایا۔

اس طرح کے نمایاں واقعات میں: 13 نومبر کو پشاور میں ایرانی کمرشل اتاشی حشمت اللہ عطار زادے کو اغوا کر لیا گیا (سال کے آخر تک انہیں رہا نہیں کیا گیا)، 11 نومبر کو صوبہ سرحد کے ضلع بنوں میں کینیڈا کی ایک فری لانس صحافی اور ویب سائٹ پبلشر خدیجہ عبدالقدیر کے اغواء کا واقعہ پیش آیا (انہیں بھی سال کے آخر تک رہا نہیں کیا گیا)، 22 ستمبر کو پشاور میں پاکستان کیلئے افغانستان کے نامزد سفیر کو اغوا کر لیا گیا (انہیں بھی سال کی آخر تک رہا نہیں کیا گیا)۔ 29 اگست کو صوبہ سرحد میں لوئر دیر سے دو چینی انجینئروں اور ان کے ایک محافظ اور ڈرائیور کو اغوا کر لیا گیا، جس کی ذمہ داری مقامی طالبان نے قبول کر لی (محافظ اور ڈرائیور کو 15 ستمبر کو رہا کر دیا گیا، ایک انجینئر 17 اکتوبر کو فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا جبکہ دوسرا سال کے آخر تک اغوا کاروں کے قید میں تھا)، یکم اگست کو جنوبی وزیرستان میں 5 عیسائیوں کو اغواء کر لیا گیا (سال کے آخر تک لاپتہ تھے)، لشکر اسلامی تنظیم کے ارکان نے 21 جون کو پشاور میں 17 عیسائیوں کو اغواء کر لیا (انہیں 22 جون کو چھوڑ دیا گیا)، 11 فروری کو خیبر ایجنسی میں افغانستان کیلئے پاکستان کے سفیر طارق عزیز الدین کو اغواء کر لیا گیا (انہیں 16 مئی کو رہا کیا گیا) اور 4 جنوری کو جنوبی وزیرستان میں 5 عیسائیوں کے اغواء کا واقعہ پیش آیا (انہیں تین دن بعد رہا کر دیا گیا)۔

14 جون کو ایک اسلامی عسکریت پسند گروپ جنداللہ نے جنوبی بلوچستان میں ایران سے ملنے والی سرحد پر 16 ایرانی گارڈز کے اغواء کے ذمہ داری قبول کر لی۔ ذرائع ابلاغ کی اطلاعات سے ظاہر ہوا کہ یہ افراد ملک میں ہی یرغمال بنا کر رکھے گئے۔

تنازعات سے متعلق دیگر استحصال

اخباری اطلاعات کے مطابق باجوڑ ایجنسی میں بمباری کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد حکومت نے اشتہار گرائے جن کے ذریعے سویلین آبادی پر زور دیا گیا کہ وہ علاقے سے چلی جائے۔ لوگوں نے اس امر پر مایوسی کا اظہار کیا کہ یہ اشتہارات فضائی بمباری کے کئی دن بعد گرائے گئے۔ اس کے ساتھ ہی عسکریت پسندوں نے لوگوں کو علاقہ چھوڑنے سے روکنے کی کوشش کی تاکہ انہیں علاقے میں روک کر انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔

(Posted on March 31, 2009)

فوجی کارروائیوں سے مقامی آبادی کیلئے اس وقت مشکلات پیدا ہوئیں جب عسکریت پسندوں نے سڑکوں تک جانے والے اہم راستے اور سرنگیں بند کر دیں اور مواصلات اور توانائی کے نظاموں پر حملے کئے جس سے تجارت کے علاوہ خوراک اور پانی کی تقسیم کے نظاموں میں خلل پڑا۔ سوات سمیت بعض علاقوں میں سیکیورٹی فورسز نے کرفیو لگا دیا۔ عسکریت پسندوں نے خاص طور پر سوات میں لڑکیوں کے 150 سے زائد سکول تباہ کر دیئے اور فاٹا اور صوبہ سرحد میں 200 سے زیادہ حجام کی دکانیں اور سی ڈیز اور ویڈیوز کی فروخت کے سٹور جبراً بند کرا دیئے۔

ڈیرہ اسماعیل خان میں خودکش بم دھماکوں اور شیعہ۔سنی فسادات کی وجہ سے صوبہ سرحد کی حکومت نے 20 اگست کو سیاسی اجتماعات اور مذہبی تقریبات پر پابندی عائد کر دی۔ یہ پابندیاں سال کے آخر تک برقرار رہیں۔

حصہ دوم: شہری آزادیوں کا احترام

الف۔ تحریر و تقریر کی آزادی

قانون کی رو سے لوگوں کو تحریر و تقریر کی آزادی حاصل ہے اور وہ عوامی مسائل پر آزادانہ طور پر بات چیت کر سکتے ہیں۔ لیکن حکومت نے سیاسی سرگرمیوں پر نظر رکھ کر اور ذرائع ابلاغ پر کنٹرول کر کے اکثر و بیشتر تنقید کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کیں۔ حکومت نے 2007 میں ہنگامی حالت کے نفاذ کے دوران ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی آزادی پر پابندی عائد کرنے کا جو آرڈیننس جاری کیا تھا وہ نافذ العمل رہا۔ تاہم نئی حکومت نے یہ آرڈیننس نافذ نہیں کیا۔ صحافیوں اور ان کے اہل خانہ کو گرفتار کیا گیا، مارا پیٹا گیا اور ڈرایا دھمکایا گیا جس کے نتیجے میں بہت سے صحافیوں نے اپنے طور پر سنسر شپ عائد کر لی۔

ملک میں انگریزی اور اردو زبان کے کئی آزاد روزنامے اور ہفت روزہ اخبار اور رسالے شائع ہوتے ہیں۔ سرکاری نیوز ایجنسی ایسوسی ایٹڈ پریس آف پاکستان، جو ملکی اور غیر ملکی خبریں مقامی ذرائع ابلاغ کو فراہم کرتی ہے، وزارت اطلاعات کے زیر انتظام اور زیر کنٹرول مصروف عمل ہے۔ چند چھوٹی نجی نیوز ایجنسیوں نے اپنے طور پر سنسر شپ کا نفاذ کر لیا۔ 'انٹر پبلک سروسز ریلیشنز' کے نام سے فوج کا پریس سے متعلق اپنا ایک شعبہ ہے۔ اس کے علاوہ دو اور شعبے خبارات پر نگاہ رکھنے کیلئے مخصوص ہیں۔ فاٹا میں کوئی اخبار شائع نہیں کیا جاتا۔ اخبارات اور جرائد کے مالکان کو آزاد کشمیر میں اشاعت کیلئے کشمیر کونسل اور امور کشمیر کی وزارت سے اجازت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ بہت سے مبصرین کے مطابق ان اداروں نے ایسی مطبوعات کی اجازت نہیں دی جس میں ایک آزاد اور خودمختار کشمیری نصب العین کے حق میں تحریریں شامل کی گئی ہوں۔

غیر ملکی رسالے اور اخبار دستیاب تھے اور ان میں سے کئی اخبارات اور جرائد نے ملک میں اپنے نمائندے مقرر کر رکھے تھے جنہوں نے آزادانہ طور پر کام کیا حالانکہ ان میں بعض کو صحافی کے حیثیت سے کام کرنے کیلئے ویزے کے حصول میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔

پاکستان ٹیلی ویژن اور پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن سرکاری ادارے ہیں جن پر حکومت کا براہ راست کنٹرول ہے۔ پی بی سی کے کئی سٹیشن ملک بھر میں کام کرتے ہیں۔ دونوں اداروں نے اپنی خبروں میں حکومتی نقطہ نظر اجاگر کیا۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی (پیمرا) آرڈیننس کی پابندیوں پر مبنی ان ترامیم کا نفاذ نہیں کیا جو سابقہ حکومت نے نافذ کی تھیں۔ ترمیم شدہ پیمرا آرڈیننس کے دائرے میں آنے والے جرائم میں دہشت گردوں کی خبریں شائع یا نشر کرنا، ملکی نظریئے کی منافی سوچ کا پرچار کرنا، سربراہ مملکت، مسلح افواج یا دوسرے اہم سرکاری اداروں کے ارکان پر نکتہ چینی کرنا اور تشدد یا تنازع کی براہ راست کو ترغیب کرنا شامل ہے

(Posted on March 31, 2009)

سابقہ حکومت نے اخبارات پر انتظامی کنٹرول بڑھانے کیلئے جو تبدیلیاں کی تھیں وہ برقرار رہیں۔

نجی کیبل اور سیٹلائٹ ٹی وی چینلز نے ملکی خبروں کی کوریج نشر کی اور اپنے طور پر سنسر شپ عائد کرنے کے باوجود انہیں حکومت پر اعتراض تھا۔ 2007 میں ہنگامی حالت کے نفاذ کے دوران جن آزاد ٹیلیویژن سٹیشنوں کو بند کر دیا گیا تھا، انہیں رضا کارانہ ضابطہ اخلاق پر دستخط کرنے کے بعد نشریات کی اجازت دیدی گئی جس کے تحت وہ رضا کارانہ طور پر کم سے کم تبصرے اور مذاکرے نشر کرنے کے پابند ہو گئے۔ ابتداء میں جیو ٹی وی نے اس ضابطہ اخلاق پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر حکومت نے 20 جنوری تک اس کی کیبل ڈسٹری بیوشن پر پابندی عائد کر دی۔

پیمرا احکام نے نجی ٹیلیویژن چینلوں پر 18 فروری کے انتخابات کی براہ راست کوریج اور پریذائیڈنگ افسروں کے فراہم کردہ نتائج کے سوا غیر حتمی نتائج نشر کرنے پر پابندی لگا دی۔ تاہم ذرائع ابلاغ نے اس پابندی کے باوجود نتائج براہ راست نشر کئے۔

جون میں پیمرا احکام نے سندھ اور پنجاب کے کئی حصوں میں آج ٹی وی نیوز کے مقبول پروگرام پر اس وقت مبینہ طور پر پابندی عائد کر دی جب اس پروگرام میں کالا باغ ڈیم کے بارے میں حکومت کی پالیسی پر تبصرہ کیا گیا۔

نجی ریڈیو سٹیشن بڑے بڑے شہروں میں قائم تھے لیکن ان کے لائسنسوں کے تحت ان پر نیوز پروگرام پیش کرنے کی پابندی تھی۔ بعض چینلوں نے اس پابندی سے روگردانی کرتے ہوئے ٹاک شوز نشر کئے۔ تاہم ان میں ملکی سیاسی صورتحال پر بحث و مباحثے سے زیادہ تر گریز کیا گیا۔ ملک میں بی بی سی اور وائس آف امریکہ سمیت بین الاقوامی ریڈیو نشریات سنی جاتی تھیں۔

پیمرا آرڈیننس کا دائرہ، فاٹا یا صوبہ سرحد کے زیر انتظام علاقوں پاٹا تک نہیں بڑھایا گیا۔ فاٹا میں آزاد ریڈیو سٹیشن کی نشریات کی اجازت نہیں دی گئی، حالانکہ عسکریت پسندوں اور مذہبی شخصیات نے تقریباً 100 غیر قانونی ریڈیو سٹیشنوں سے نشریات جاری رکھی ہوئی تھیں۔

غیر سرکاری تنظیم انٹر میڈیا کے مطابق 23 دسمبر تک ذرائع ابلاغ اور صحافیوں کے خلاف 40 حملے کئے گئے۔ کم از کم 13 صحافیوں کو ہلاک اور 40 کو اغواء یا گرفتار کر لیا گیا (پاکستان پیپلز پارٹی کی مخلوط حکومت قائم ہونے کے بعد اس قسم کی محض ایک گرفتاری کے اطلاع ملی)۔ ڈرانے دھمکانے کے 118 واقعات پیش آئے جبکہ ذرائع ابلاغ کی املاک پر 4 حملے کئے گئے۔ صحافیوں اور ذرائع ابلاغ کے تقریباً 89 مقدمات عدالتوں میں زیر سماعت تھے۔

سال کے دوران سیکیورٹی فورسز، سیاسی جماعتوں، عسکریت پسندوں اور نامعلوم گروپوں نے میڈیا کے اداروں، صحافیوں اور صحافیوں کے اہل خانہ کو حملوں کا نشانہ بنایا اور ڈرایا دھمکایا۔ صحافیوں کو اغواء بھی کیا گیا۔ اخبارات میں حکومت، سیاسی لیڈروں اور فوجی کارروائیوں پر بار بار نکتہ چینی کی جاتی رہی۔ میڈیا کے جن اداروں نے از خود سنسر شپ نہیں کی انہیں بعض اوقات سزا کا سامنا کرنا پڑا۔

6 فروری کو سیالکوٹ میں چار پولیس اہلکاروں نے ایک صحافی عون ساہی کو روکا، ان کی تلاشی لی اور ان پر جسمانی تشدد کیا۔ صحافی نے اس واقعے کے خلاف ایف آئی آر درج کرائی۔ ڈسٹرکٹ پولیس آفیسر امین وائیں نے مبینہ طور پر چاروں پولیس اہلکاروں کو معطل کر کے محکمانہ کارروائی کا حکم دیا۔

9 فروری کو بلوچستان کے شہر کوئٹہ میں نامعلوم مسلح افراد نے اخبار جہاں کے کالم نویس ڈاکٹر عبدالصمد کو، جن کا قلمی نام ڈاکٹر چشتی مجاہد تھا، ہلاک کر دیا۔ بعد میں بلوچ لبریشن آرمی نے اس قتل کی ذمہ داری قبول کر لی اور دعویٰ کیا کہ یہ اقدام ڈاکٹر صمد کی طرف سے بلوچ تحریک آزادی کو سبوتاژ کرنے کے خلاف جوابی کارروائی کے طور پر کیا گیا ہے۔

صحافیوں کے تحفظ کے بارے میں کمیٹی کے مطابق 9 مئی کو سپریم کورٹ نے از خود نوٹس لیتے ہوئے جیو ٹی وی اور اردو اخبار جنگ کو حکم دیا کہ وہ عدلیہ کی بحالی اور عدالت کی جاری کارروائیوں کے بارے میں رپورٹنگ بند کر دیں۔ بعد میں سپریم کورٹ نے یہ نوٹس واپس لے لیا اور ذرائع ابلاغ سے

(Posted on March 31, 2009)

کہا کہ وہ اپنی خبریں شائع یا نشر کرنے سے پہلے عدالتوں سے ان کی تصدیق کرالیں۔

22 مئی کو ایک نجی ٹی وی ایکسپریس اور اردو اخبار ایکسپریس کے رپورٹر محمد ابراہیم خان کو اس وقت ہلاک کر دیا گیا جب وہ باجوڑ میں عسکریت پسند لیڈر مولوی عمر کا انٹرویو لینے کے بعد واپس جا رہے تھے۔ عینی شاہدوں کے مطابق حملہ آوروں نے ابراہیم خان کو گولی مارنے سے پہلے ان سے موبائل فون، انٹرویو کی ویڈیو ریکارڈنگ، کیمرہ اور تحریری مواد لے لئے۔

7 ستمبر کو جیو ٹی وی کے ایک مذہبی پروگرام کے اینکر عامر لیاقت حسین نے کہا کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق احمدی فرقے کے لوگوں کو ہلاک کرنا واجب ہے۔ کچھ ہی دن بعد سندھ میں دو مقامی احمدی لیڈروں کو قتل کر دیا گیا۔ (سیکشن 1۔الف دیکھئے)

8 نومبر کو سوات میں سیکیورٹی فورسز نے ایک مقامی اخبار 'خبرکار' کے رپورٹر قاری محمد شعیب کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا۔ شعیب کی گاڑی میں، جسے وہ خود چلا رہے تھے، سوار ایک شخص نے بتایا کہ سیکیورٹی اہلکاروں نے کسی انتباہ کے بغیر فائرنگ شروع کر دی جبکہ فوج نے دعوی کیا کہ ان پر انتباہی فائرنگ کی گئی تھی۔

14 نومبر کو پشاور میں دو صحافیوں پر، جن میں سے ایک جاپانی باشندہ تھا، اس وقت کئی فائر کئے گئے جب وہ قریبی خیبر ایجنسی میں ایک طالبان کمانڈر کا انٹرویو لیکر واپس جا رہے تھے۔ دونوں صحافی، بین الاقوامی نامہ نگار سمیع یوسف زئی اور اساہی شمبن کیلئے اسلام آباد کے بیورو چیف یشکو رامٹو کی حملے میں محفوظ رہے۔ سال کے آخر تک پولیس نے کسی مشتبہ شخص کو گرفتار نہیں کیا تھا۔

جنوری 2007 میں ایک سندھی روزنامے 'نجات' کے ایڈیٹر مخدوم ہاشمی کے قتل کے سلسلے میں سال کے آخر تک کوئی گرفتاری عمل میں نہیں لائی گئی تھی۔ ہاشمی نے کئی مقامی وڈیروں پر نکتہ چینی اور ان کی سیاست کی مخالفت کی تھی۔ ہلاکت سے پہلے انہوں نے کہا تھا کہ انہیں دھمکیاں دی گئی ہیں اور صوبائی حکام نے تحفظ فراہم کرنے سے متعلق ان کی درخواستیں مسترد کر دی تھیں۔

فاٹا میں خیبر ایجنسی کے پولیٹیکل ایجنٹ نے پشاور میں تعینات روزنامہ ایکسپریس کے صحافی سہیل قلندر اور ان کے ساتھی کے اغواء کے سلسلے میں ایف سی آر کے اجتماعی سزا کے قانون کے تحت ایجنسی میں 44 قبائلیوں کو حراست میں لے لیا۔ دونوں صحافیوں کو 50 دن بعد رہا کر دیا گیا تھا۔ انہوں نے انسانی حقوق کے مبصرین کو بتایا کہ ان سے بدسلوکی کی گئی، ناقص غذا اور نشہ آور اشیاء دی گئیں۔ ان کی رہائی کے بعد پولیٹیکل ایجنٹ نے قبائلیوں کو بھی چھوڑ دیا۔

ایک صحافی لال ملہی کے کیس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی جنہوں نے بلوچستان میں لوگوں کے لاپتہ ہونے کے بارے میں ایک دستاویزی فلم تیار کی تھی اور سیکیورٹی فورسز نے مارچ 2007 میں انہیں دھمکی دی تھی۔ مقامی افراد کے احتجاج پر پولیس نے سیکیورٹی آفیسر کے خلاف مقدمہ درج کرنے کا وعدہ کیا لیکن کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

آر ایس ایف کے مطابق اپریل 2007 میں جنوبی وزیرستان میں عسکریت پسندوں نے ایک اردو روزنامہ 'انکشاف' کے رپورٹر دین محمد کے خاندان کے چار افراد کو ہلاک اور تین کو اغوا کر لیا۔ سال کے دوران دین محمد کو ڈرایا دھمکایا گیا۔ حکومت نے انہیں محدود سیکیورٹی فراہم کر دی اور معمولی معاوضہ دیدیا۔ دین محمد، پوری طرح اپنا کام دوبارہ شروع نہیں کر سکے۔

سال کے آخر تک حکام نے مئی 2007 کے اس کیس کے سلسلے میں کوئی گرفتاری نہیں کی جس میں دو نامعلوم افراد نے ساؤتھ ایشیا نیوز ایجنسی کے ایڈیٹر انچیف شکیل ترابی پر حملہ کیا اور انہیں مارا پیٹا۔ انہیں اسلام آباد میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس بحران کی کوریج کرنے کی وجہ سے نشانہ بنایا گیا۔

(Posted on March 31, 2009)

کراچی میں آج ٹی وی سٹیشن پر حملے اور املاک کو نقصان پہنچانے پر سال کے دوران کوئی گرفتاری عمل میں نہیں لائی گئی۔ یہ واقعہ مئی 2007 میں ٹی وی سٹیشن سے ایک پرتشدد مظاہرے کی براہ راست کوریج کی وجہ سے پیش آیا۔ کراچی یونین آف جرنلسٹ کے صدر نے ایم کیو ایم کو اس حملے کا ذمہ دار قرار دیا لیکن ایم کیو ایم کے عہدیداروں نے اس کی تردید کی۔

روزنامہ مشرق کے نامہ نگار نصر اللہ آفریدی کے کیس کے سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی جن کے گھر کو، خیبر ایجنسی میں عسکریت پسندوں کی سرگرمیوں کی رپورٹنگ کرنے پر مقامی عسکریت پسندوں نے مئی 2007 میں دستی بموں سے نشانہ بنایا تھا۔ مقامی حکام نے ان کی جانب سے اس کیس میں مداخلت کی اور بات چیت کے ذریعے معاملہ طے کرا دیا۔

سال کے آخر تک ستمبر 2007 کے اس کیس کے سلسلے میں کوئی گرفتاری نہیں کی گئی جس میں ایک نامعلوم شخص نے اسلام آباد میں ترابی کے 14 سالہ بیٹے حسن شرجیل کو مارا پیٹا تھا۔ سی پی جے کے مطابق اس شخص نے حسن نے کہا "ہم نے تمہارے والد سے کہا تھا کہ جھوٹی تحریریں بند کر دے لیکن اس نے ہماری کوئی بات نہیں سنی۔ یہ واقعہ اسے سبق سکھانے کیلئے کافی ہوگا۔"

پشاور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے اس حکم کے باوجود کہ حیات اللہ خان کے قتل اور اس کے بعد ان کی بیوہ کی ہلاکت کے واقعات کی مزید تحقیقات کی جائیں، اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ حیات اللہ خان کو دسمبر 2005 میں اغواء کئے جانے کے بعد جون 2006 میں ہلاک کر دیا گیا تھا جبکہ ان کی بیوہ دسمبر 2007 میں اپنے گھر میں پھینکے گئے ایک بم کے دھماکے میں ہلاک ہوگئی تھیں۔

ڈیرہ اسماعیل خان میں پولیس، ستمبر 2006 میں ایک صحافی مقبول حسین سیال کے قتل کے سلسلے میں گرفتار کئے گئے مشتبہ افراد میں سے کسی کی شناخت نہیں کر سکی۔ سیال، آن لائن نیوز ایجنسی کیلئے کام کرتے تھے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے ایک لیڈر کا انٹرویو لینے جا رہے تھے۔

انسداد دہشت گردی ایکٹ کے تحت فرقہ وارانہ نفرت بڑھانے والا مواد رکھنے اور تقسیم کرنے یا ایسا مواد کالعدم تنظیموں سے حاصل کرنے پر پابندی ہے۔ انٹرمیڈیا کے مطابق بنیاد پرستی کو ہوا دینے کی ایسی مطبوعات کے خلاف سات کارروائیاں کی گئیں۔ ان میں سے تین کارروائیاں پنجاب اور دو، دو صوبہ سرحد اور سندھ میں کی گئیں۔

غیر ملکی کتابیں دوبارہ طباعت سے پہلے سنسر شپ کے سرکاری عمل سے گزاری جاتی ہیں۔ تاہم، عملی طور پر سال کے دوران کسی کتاب پر پابندی عائد کرنے کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ کتابیں اور رسالے آزادانہ طور پر درآمد کئے جا سکتے ہیں لیکن قابل اعتراض جنسی یا مذہبی مواد کے باعث ان کی سنسر شپ لازمی قرار دی گئی ہے۔

مخرب الاخلاق لٹریچر، سرکاری لحاظ سے اس کیٹیگری کی توضیح کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ایسے لٹریچر کی ضبطی لازمی ہے۔ ٹیلی ویژن اور ریڈیو ایسے موضوعات پر ڈرامے اور دستاویزی پروگرام پیش کرتے ہیں جن پر پہلے پابندی تھی۔ ان میں بدعنوانی، سماجی مراعات، منشیات، خواتین کے خلاف تشدد اور صنفی امتیاز کے موضوعات شامل ہیں۔

انٹرنیٹ کی آزادی

اگرچہ اس بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی کہ حکومت نے انٹرنیٹ تک لوگوں کی رسائی محدود کی ہو لیکن ملک میں قائم کی گئی بعض انتہا پسند اور بلوچ ویب سائٹس پر قابو پانے کی کوشش کی گئی۔

(Posted on March 31, 2009)

انٹرنیشنل ٹیلی کمیونیکیشن یونین نے دعوی کیا کہ مارچ تک ملک میں انٹرنیٹ کے صارفین کے تعداد ایک کروڑ پچھتر لاکھ سے زیادہ تھی اور نیٹ سروس ملک کے تقریباً تمام شہروں اور قصبوں میں دستیاب تھی۔

مقامی ذرائع نے اطلاع دی کہ حکام نے بلوچستان کیلئے آزادی کی علمبردار دو ویب سائٹس: بلوچ وائس اور ولوچ وارنا پر پابندی برقرار رکھی۔

24 فروری کو پاکستان ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی PTA نے انٹرنیٹ سروسز فراہم کرنے والوں کو حکم دیا کہ ویب سائٹ 'یوٹیوب' مبینہ طور پر توہین رسالت مواد کی وجہ سے بلاک کی جائے۔ اس اقدام کے باعث دنیا بھر میں یہ ویب سائٹ چند گھنٹے بند رہی، حالانکہ PTA نے دعوی کیا کہ یہ مسئلہ ملک سے باہر کسی خرابی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ حکام نے ملک کے اندر یہ رکاوٹ 26 فروری کو ختم کر دی۔

6 نومبر کو صدر زرداری نے الیکٹرانک جرائم کی روک تھام کا آرڈیننس جاری کیا۔ جس کی رو سے انٹرنیٹ کے ذریعے پھیلائی جانے والی دہشت گردی کے نتیجے میں موت واقع ہونے کی صورت میں موت یا عمر قید کی سزا دی جاسکتی ہے۔

تعلیم کی آزادی اور ثقافتی واقعات

حکومت نے عام طور پر تعلیم کی آزادی پر کوئی پابندی عائد نہیں کی لیکن سیاسی جماعتوں سے وابستہ طلبا تنظیموں کی طرف سے پیدا کردہ تشدد اور عدم رواداری کی فضا کے باعث تعلیمی آزادی کو محدود کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ کراچی کے بعض یونیورسٹی کیمپسز میں مسلح طلبا گروپوں کے درمیان، جن کا تعلق زیادہ تر کل پاکستان متحدہ طلبا تنظیم (ایم کیو ایم سے وابستہ) اور اسلامی جمیعت طلبا (جماعت اسلامی سے وابستہ) سے تھا، زبان، نصابی مواد، امتحانات کی پالیسیوں، گریڈز، نظریات اور لباس جیسے معاملات پر جھڑپیں ہوئیں اور انہوں نے دوسرے طلبا، اساتذہ اور انتظامی عملے کے ارکان کو ڈرایا دھمکایا۔

ان گروپوں نے امتحانات میں طلبا کو نقل کرنے میں مدد دینے اور عملے کی خدمات کے حصول میں مداخلت کرنے کے علاوہ یونیورسٹیوں میں داخلے اور بعض اوقات ادارہ جاتی فنڈز کے استعمال کیلئے اثر ورسوخ سے کام لیا۔ انہوں نے یہ اثر ورسوخ عام طور پر احتجاجی ریلیوں، کیمپس میڈیا پر کنٹرول اور بڑے پیمانے پر تشدد کی دھمکیوں کے ذریعے حاصل کیا۔ ایسے واقعات کی وجہ سے یونیورسٹی حکام نے کئی کیمپسز میں سیاسی سرگرمیوں پر محدود پیمانے کی پابندی عائد کر دی۔

31 مارچ کو رینجرز نے کراچی یونیورسٹی کے شعبہ اپلائیڈ کیمسٹری کے پروفیسر ڈاکٹر ریاض احمد کو زدوکوب کیا۔ پاکستان کے انسانی حقوق کمیشن کے مطابق طلبہ کے مختلف گروہوں کے درمیان تصادم کے بعد یونیورسٹی میں تعینات ہونے والے رینجرز نے ڈاکٹر کو یونیورسٹی سے نکلتے ہوئے روکا اور انھیں ڈنڈوں سے مار مار کر شدید زخمی کر دیا۔ متعلقہ حکام نے اس ناروا سلوک پر رینجرز کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔

22 اپریل کو بلوچ لبریشن آرمی نے یونیورسٹی آف بلوچستان کے پرو وائس چانسلر ڈاکٹر صفدر کیانی کو ''پنجابی'' ہونے کے جرم میں قتل کر دیا۔ اس واقعے کا سوگ منانے کے لیے یونیورسٹی اور بولان میڈیکل کالج ایک روز کے لیے بند رہے۔ سارا سال کیمپس کے اندر صورت حال کشیدہ رہی لیکن بہر حال پڑھائی جاری رہی۔

یونیورسٹی میں کام کرنے والی سات طلبہ تنظیموں نے صوبے کے تعلیمی اداروں میں سیاسی مداخلت پر نظر رکھنے کے لیے آپس میں ایک متفقہ ضابطہ اخلاق تیار کیا۔

(Posted on March 31, 2009)

ملکی اور غیر ملکی فلموں کی نمائش سے پہلے انھیں دیکھنے کا ذمہ دار ادارہ مرکزی سنسر بورڈ وزارت ثقافت کے تحت کام کرتا ہے۔ اگر عملی اعتبار سے دیکھا جائے تو پورے سال کے دوران میں کسی فلم پر پابندی نہیں لگائی گئی۔ تصاویر اور فن پاروں کی نمائش، موسیقی کی محافل اور دیگر ثقافتی سرگرمیوں پر حکومت کی طرف سے کوئی قدغن نہیں لگائی گئی۔

پرامن اجتماعات اور انجمن سازی کی آزادی

قانون میں اجتماعات منعقد کرنے اور انجمن بنانے کی آزادی کچھ شرائط کے ساتھ دی گئی ہے۔

لیکن عملی اعتبار سے حکومت نے اجتماع کرنے پر بعض مخصوص پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ قانون کی رو سے ضلعی حکام چار سے زائد افراد کے جمع ہونے پر کسی بھی وقت پابندی لگا سکتے ہیں۔ ویسے اگر دیکھا جائے تو 1984ء سے اب تک احمدی کوئی اجتماع یا کانفرنس منعقد کرنے نہیں دی گئی، 2006ء کے برعکس پورے سال کے دوران میں کوئی ایسی اطلاع نہیں ملی کہ حکومت نے کالعدم انتہا پسند مذہبی تنظیموں کو جلسے جلوس نکالنے کی اجازت دی ہو۔

اکثر و بیشتر پولیس سیاسی کارکنوں، صحافیوں، سول سوسائٹی کے اراکین اور مظاہرین کو روکنے کے لیے پکڑ دھکڑ اور طاقت کا اندھا دھند استعمال کرتی ہے۔

13 جنوری کو پولیس نے کراچی میں جسٹس ریٹائرڈ بھگوان داس کی اپنے گھر میں نظر بندی کے خلاف ان کی رہائش گاہ سے باہر مظاہرہ کرنے والے سول سوسائٹی کے اراکین کے خلاف طاقت کا بھرپور استعمال کیا۔ پاکستان کے انسانی حقوق کمیشن کے مطابق مرد پولیس والوں نے مظاہرے میں شریک خواتین کے ساتھ دست درازی کی۔ مرد مظاہرین کو مارا پیٹا اور آٹھ افراد کو گرفتار کیا۔

21 فروری کو پولیس نے کراچی میں سٹی کورٹس سے باہر وکلاء کے ایک پرامن مظاہرے کو منتشر کرنے کے لیے بے تحاشہ طاقت استعمال کی۔ یہ وکلاء معزول ججوں کی بحالی، عدلیہ کی آزادی اور قانون کی حکمرانی کے حق میں مظاہرہ کر رہے تھے۔ وردی پوش اور سادہ کپڑوں میں ملبوس پولیس اہلکاروں نے آنسو گیس چھوڑی، لاٹھی چارج کیا جس سے پانچ وکلاء زخمی ہوئے اور نو وکلاء کو گرفتار کیا گیا اس واقعے کی کوئی تحقیقات نہیں کی گئی۔

15 جولائی کو رینجرز نے اسلام آباد میں پی ٹی سی ایل کے ملازمین کو ان کے صدر دفتر کے باہر بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا۔ یہ ملازمین اپنے ادارے کی نجکاری کے خلاف احتجاج کر رہے تھے رینجرز نے ملازمین پر آنسو گیس پھینکی اور ان پر لاٹھی چارج کیا تاہم کوئی شخص شدید زخمی نہیں ہوا۔

انجمن سازی

آئین میں کچھ قانونی پابندیوں کے ساتھ انجمن سازی کا حق دیا گیا ہے۔ این جی اوز پر لازم ہے کہ وہ اپنے آپ کو رجسٹرڈ کرائیں۔ فریڈم ہاؤس کے مطابق ملک میں کام کرنے والی ایک لاکھ کے لگ بھگ این جی اوز میں سے نصف حکومت کے ہاں رجسٹرڈ ہیں۔ کسی قابل ذکر این جی او کی طرف سے اس سال کے دوران میں رجسٹریشن کے حوالے سے کوئی شکایت سامنے نہیں آئی۔ بعض این جی اوز رجسٹریشن کے بغیر بھی کام کرتی رہیں اور ان کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی گئی۔

فریڈم ہاؤس کے مطابق این جی او کیمونٹی نے وزارت خصوصی تعلیم و سماجی بہبود کی طرف سے 2007ء کے اوائل میں متعارف کرائے گئے رضا کارانہ ضابطہ اخلاق کے خلاف احتجاج کیا اس ضابطہ اخلاق کی رو سے حکومت کو یہ اختیار حاصل ہو گیا ہے کہ وہ کسی این جی او کے دائرہ عمل کو متعین کر سکے اس کے اراکین اور انتظامیہ میں تبدیلیاں لا سکے اور عدم تعاون کی صورت میں اس تنظیم کے اثاثے منجمد کر سکے۔ عملی طور پر اس ضابطہ اخلاق کو نافذ نہیں

(Posted on March 31, 2009)

کیا گیا اور نہ ہی کسی این جی او کے کام میں رکاوٹ ڈالی گئی۔صوبہ سرحد اور فاٹا میں عدم استحکام کی وجہ سے این جی اوز کے اراکین کا تحفظ ایک مسئلہ بنا رہا اسی طرح سے خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے والی تنظیموں کو بھی دباؤ کا سامنا رہا۔سال ختم ہونے تک این جی اوز کے سات ملازمین قتل ہو چکے تھے سات افراد کو اغوا کر لیا گیا تھا اگر چہ انھیں بعد میں رہا کرا لیا گیا تاہم بے شمار ملازمین کو ڈرایا دھمکایا گیا۔

25 فروری کو مانسہرہ میں بعض مسلح افراد نے ایک برطانوی این جی او Plan-International کے دفتر پر حملہ کر کے چار افراد کو ہلاک کر دیا پولیس نے تین مشتبہ افراد کو گرفتار کیا جس میں ایک جنگجو تنظیم کا سربراہ بھی شامل ہے۔ان افراد کو مارچ میں ایک عدالت کے سامنے پیش کیا گیا اور اس وقت سے انہیں کڑی نگرانی میں قید رکھا گیا ہے۔

اپریل کے آخر میں سوات میں ایک این جی او کی خاتون رکن کو قتل کر کے اس کی لاش کی بے حرمتی کی گئی۔

مذہب کی آزادی

آئین کی رو سے مذہبی اقلیتوں کا اپنے اپنے مذہب پر کاربند رہنے اور عمل کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے لیکن عملی طور پر حکومت نے مذہب پر قائم رہنے کی آزادی کو محدود کیا ہوا ہے۔اسلام مملکت کا مذہب ہے اور آئین کے مطابق تمام قوانین کا اسلام کے ساتھ مطابقت رکھنا ضروری ہے۔آئین کی رو سے قرآن سے متصادم صورت حال میں شریعت کے مطابق فیصلے کیے جائیں گے۔یوں عام شہریوں پر سیکولر قانون کا اطلاق ہونے کے باوجود شریعت کو بالادستی حاصل ہے۔بعض قبائلی علاقوں میں شرعی قوانین نافذ ہیں۔صوبہ سرحد میں صوبائی حکومت کے زیر انتظام قبائلی علاقوں میں علما عدالتوں میں ججوں کی مشاورت کے لیے تعینات ہیں،تمام شہریوں پر شریعت اور توہین رسالت کے قوانین کا اطلاق ہوتا ہے۔اظہار رائے کی آزادی پر آئینی اعتبار سے ایسی پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں جو اسلام کی عظمت کی تحفظ کے لیے ضروری سمجھی جائیں۔

اسلام سے منحرف ہونے والے مرتد افراد کے خلاف تادیبی کارروائیاں ایک معمول ہیں۔مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو اکثر و بیشتر جبر و تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور بعض اوقات پولیس اس طرح کی کارروائیوں کو روکنے یا ان کے مرتکب افراد کے خلاف کارروائی کرنے سے اجتناب کرتی ہے۔گویا انہیں من مانی کارروائیوں کے لیے ایک کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے۔آئین کی رو سے صدر اور وزیر اعظم کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔وزیر اعظم،وفاقی وزیر اور وزرار مملکت کے ساتھ ساتھ سینٹ اور قومی اسمبلی کے اقلیتوں سمیت منتخب اراکین پر لازم ہے کہ وہ پاکستان کی بنیاد بننے والے اسلامی نظریہ کے تحفظ کے لیے کام کرنے کا حلف اٹھائیں۔

تمام مذہبی گروہوں کے لیے رجسٹریشن کرانا ضروری ہے تاہم حکومت کی طرف سے کسی گروپ کو رجسٹرڈ نہ کرنے کی کوئی شکایت موصول نہیں ہوئی ہے۔

قانون کے مطابق احمدی کافر ہیں جبکہ وہ خود کو مسلمان سمجھتے ہیں۔قانون کی رو سے بیس لاکھ کے لگ بھگ احمدی کمیونٹی کسی اسلامی شعار کو اختیار نہیں کر سکتی نہ وہ مسلمانوں کی طرح آپس میں سلام کر سکتے ہیں،نہ اپنی عبادت گاہوں کو مسجد کہہ سکتے ہیں،نہ حج کے لیے جا سکتے ہیں اور نہ ہی روزہ رکھ سکتے ہیں۔انھیں تبلیغ کرنے اپنا لٹریچر تقسیم کرنے یا اجتماعات منعقد کرنے کی آزادی بھی نہیں ہے۔

شناختی کارڈ کے حصول،ووٹ کے اندراج اور پاسپورٹ بنوانے کے لیے درکار فارم مذہب کے خانے میں خود کو مسلمان لکھنے والوں پر لازم ہے کہ وہ احمدیت کے بانی کی تعلیمات کی نفی کریں۔

احمدیوں کا دعویٰ ہے کہ سال بھر کے دوران میں اکتیس احمدیوں کو اپنے مخصوص عقائد کی وجہ سے فوجداری مقدمات کا سامنا کرنا پڑا۔اے ایچ

(Posted on March 31, 2009)

آرسی کے مطابق اس سال کے دوران میں چار احمدیوں کو قتل کیا گیا۔

ضابطہ فوجداری کے مطابق پیغمبر آخر الزمان نبی کریم ﷺ کی نعوذ باللہ توہین کا ارتکاب کرنے والے شخص کو سزائے موت یا عمر قید کی سزا سنائی جاسکتی ہے۔ آخری آسمانی کتاب قرآن مجید کی توہین کرنے والوں کو عمر قید اور کسی بھی دوسرے مذہب کے عقائد کی بے حرمتی کرنے پر دس سال کی قید سنائی جاسکتی ہے۔ مذہبی عقائد کی بے حرمتی پر تادیبی کاروائی کی شق اب تک صرف ان افراد کے خلاف استعمال ہوئی ہے جنھوں نے مبینہ طور پر نعوذ باللہ توہین رسالت کا ارتکاب کیا تھا۔ تحریک ختم نبوت اور اس قسم کی دیگر تنظیمیں حضرت محمد ﷺ کو خاتم النبیین تصور نہ کرنے والے تمام افراد کو کافر اور ملحد قرار دیتی ہیں اور احمدیوں کے عقائد کو برا بھلا کہتی ہیں لیکن حکام کی طرف سے کوئی کاروائی نہیں کی جاتی۔

8 جون کو پولیس نے احمدیوں کے خلاف قوانین کے تحت پنجاب کے شہر ربوہ کے تمام شہریوں کے خلاف مقدمہ درج کر کے ایک شخص یونس کو گرفتار کیا، ایف آئی آر کے مطابق چونکہ ربوہ کے ہزاروں شہریوں نے چراغاں اور آتشبازی کی تھی اور ایک دوسرے کو مبارک باد دی تھی۔ اس لیے حکومت نے ان کے ایسا کرنے کو اپنے عقائد کی تبلیغ تصور کرتے ہوئے یہ مقدمہ درج کیا تھا سال کے آخر تک اس مقدمے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوسکی تھی۔

اگست میں ملتان کے قرب وجوار میں آباد لوگوں نے علاقے میں رہنے والے احمدیوں کو اپنی عبادت گاہیں بند کرنے کا کہا، جب انھوں نے انکار کیا تو مقامی لوگوں نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی کہ احمدی اپنی ان عبادت گاہوں کے ذریعے اپنے عقائد کی تبلیغ میں مصروف ہیں، پولیس نے علاقے میں احمدیوں کو اپنی عبادت گاہیں ''عارضی طور'' پر بند کرنے کی ہدایت کی اور سال کے آخر تک یہ عبادت گاہیں بند رہیں۔

دس ستمبر کو لاہور ہائی کورٹ کے ملتان بنچ نے قرار دیا کہ دو عیسائی لڑکیوں کو اغوا کر کے ان میں سے ایک کے ساتھ شادی کرنے والے شخص کو اس کی بیوی حوالے کی جائے۔ کرسچن سالیڈیریٹی ورلڈ وائڈ کے مطابق پنجاب کے ضلع مظفر گڑھ میں تین افراد نے تیرہ سالہ صبا مسیح اور اس کی نو سالہ بہن انیلہ کو اغوا کیا ان دونوں لڑکیوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا اور پھر صبا کو اغوا کاروں میں سے ایک شخص کے ساتھ بیاہ دیا گیا۔ عدالت عالیہ نے انیلہ کو اس کے والدین کے حوالے کر دیا تھا۔

9 اکتوبر کو گل شیر مسیح اور اس کی بیٹی صندل گل شیر کو گرفتار کیا گیا گل شیر مسیح پر الزام تھا کہ اس نے قرآن مجید کی بے حرمتی کی ہے وہ دونوں سال کے آخر تک حراست میں رہے۔

اس سال کے دوران میں جنوری 2007ء کے اس مقدمے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی جس میں انٹیلی جینس بیورو کے ایک ضلعی افسر نے پانچ احمدیوں کی گرفتاری کا حکم دیا تھا ان میں دو بچے بھی شامل تھے جن کی عمریں آٹھ اور گیارہ برس تھیں ان کے استاد نے ان بچوں کے پاس احمدیوں کی طرف سے شائع ہونے والا بچوں کا ایک رسالہ ''تشہیز الاذھان'' دیکھا تھا اخبارات میں اس مقدمے کے بارے میں تواتر سے شائع ہوتا رہا جس کے بعد یہ مقدمہ واپس لے لیا گیا۔ ایک ماہ بعد فروری 2007ء یہ مقدمہ دوبارہ دائر کیا گیا اور اس میں دو افراد کو نامزد کیا گیا۔

مارچ 2007ء میں منڈی بہاؤالدین کے قریب ایک گاؤں سیراہ کے ایک ریسٹورنٹ میں ایک ریٹائرڈ اے ایس آئی ریاض گوندل نے احمدی مذہب قبول کرنے والے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا۔ قاتل نے بعد میں پولیس سٹیشن جا کر اقبال جرم کر لیا تھا اور خود کو پولیس کے حوالے کر دیا تھا اس کا موقف تھا کہ اسلام میں مرتد کی یہی سزا ہے۔ سال گزر جانے کے باوجود وہ مقید رہا اور اس مقدمے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔

جنوری 2007ء میں قرآن کی توہین کرنے کے الزام میں گرفتار ہونے والی مارتھا بی بی کے مقدمے میں بھی صورت حال جوں کی توں رہی۔ جس کو 2007ء میں ضمانت پر رہا کر دیا گیا تھا۔ مارتھا کا کہنا تھا کہ اس نے قرآن پاک کے بارے میں کوئی نازیبا بات نہیں کی اور اس پر یہ جھوٹا الزام

(Posted on March 31, 2009)

ان مسلمان ٹھیکیداروں نے لگایا ہے جو اس کے شوہر سے سامان خریدنے کے بعد رقم ادا کرنے سے منکر ہو چکے ہیں۔ ستمبر 2006ء میں قرآن پاک کی بے حرمتی کرنے کے الزام میں گرفتار ہونے والے شاہد مسیح کا مقدمہ بھی آگے نہیں بڑھ سکا۔ شاہد کو فیصل آباد میں چوری کرنے اور قرآن پاک کو آگ لگانے کے پر گرفتار کیا گیا تھا اور جنوری 2007ء میں اسے ضمانت پر رہا کیا گیا تھا۔

توہین رسالت اور توہین قرآن پاک کے قوانین کے تحت زیادہ تر شکایات کے پیچھے ذاتی اور کاروباری مفادات ہوتے ہیں اور لوگ دوسرے مسلمان افراد اور اقلیتوں کو ملوث کر دیتے ہیں سب سے زیادہ شکایات اکثریتی سُنی مسلمانوں نے دوسرے سُنی مسلمانوں کے خلاف درج کرائیں، اپیلوں کی سماعت کرنے والی عدالتیں اس طرح کے زیادہ تر مقدمات خارج کر دیتی ہیں تاہم ملزمان برسوں جیلوں میں مقدمات کے فیصلے کے انتظار میں سڑتے رہتے ہیں۔ مقدمات کی سماعت کرنے والی عدالتیں توہین کے مقدمات میں ملوث افراد کو بری کرنے یا ضمانت پر رہا کرنے سے ہچکچاتی ہیں کیونکہ انھیں انتہا پسند مذہبی گروہوں کی طرف سے تشدد کا خطرہ ہوتا ہے۔ 2005ء میں صدر نے ایک قانون پر دستخط کئے جس کی رو سے توہین کے مقدمات کے اندراج سے پہلے پولیس کے اعلیٰ حکام کی ذمہ داری لگائی گئی کہ وہ حقائق اور شواہد کا جائزہ لیں تا کہ ذاتی عناد اور مفادات کے لیے درج ہونے والی شکایتوں کی چھان بین کی جا سکے تاہم مذہبی و انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والی تنظیموں کا کہنا ہے کہ مقدمات کا جائزہ لینے کے لیے درکار وسائل کی کمی کے باعث سینئر پولیس حکام اس قانون پر عمل درآمد سے قاصر ہیں۔ 2007ء میں عدالتوں نے توہین کے مقدمات میں دو افراد کو سزا سنائی، دو کو بری کیا جبکہ 71 مقدمات سال کے آخر تک زیر سماعت رہے۔

4 نومبر کو عدالت نے مئی میں گرفتار ہونے والے ایک عیسائی ڈاکٹر روبن سردار کو توہین کے مقدمے میں بے گناہ قرار دے کر رہا کر دیا۔ کمیشن برائے امن و انسانی ترقی کے مطابق ڈاکٹر روبن سردار کو اپنی جان کے خوف کے باعث روپوش ہونا پڑا اور سال کے آخر تک وہ روپوش رہا۔

عیسائیوں اور ہندوؤں کی عبادت گاہوں پر کوئی قانونی قدغن نہیں ہے۔ کسی بھی جگہ نئے مندر یا گرجا گھر کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے ضلعی ناظم اس کی تعمیر کی اجازت دینے کا مجاز ہے۔ تاہم مذہبی اقلیتوں کے اراکین کو زمین کی خریداری اور اپنی عبادت گاہوں کی تعمیر کی اجازت کے حصول میں افسر شاہی کے تاخیری حربوں اور رشوت ادا کرنے کے مطالبات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سرکاری سکولوں میں تمام مسلمان طلبہ و طالبات کو اسلامیات کا مضمون لازمی طور پر پڑھنا ہوتا ہے۔ دیگر مذاہب کے طلبہ پر اسلامیات کا مضمون پڑھنا لازم نہیں ہے۔ تاہم عملی اعتبار سے اکثر سکولوں میں اساتذہ انہیں مجبور کرتے ہیں کہ وہ اسلامیات پڑھیں۔

سماجی ناہمواری اور امتیازی رویے

پورے سال سنی اور شیعہ انتہا پسند گروپوں کے ایک دوسرے پر حملے جاری رہے۔ عیسائی اور احمدی افراد پورے ملک میں مذہبی تشدد کی کارروائیوں کا نشانہ بنتے رہے۔

نیشنل کمیشن فار جسٹس اینڈ پیس کے مطابق پورے سال کے دوران میں ملک بھر میں ایک چرچ ایک ہندوؤں کا مندر اور احمدیوں کی پانچ عبادت گاہوں پر حملے کیے گئے۔ عبادت گاہوں پر حملے کے سات واقعات میں سے چار صوبہ پنجاب میں وقوع پذیر ہوئے۔

اسی عرصے کے دوران میں 53 احمدی افراد اور 93 عیسائیوں پر قرآن مجید کی بے حرمتی کرنے کے الزامات کے تحت مقدمات چلائے گئے یا انہیں قید کا سامنا کرنا پڑا۔

انسانی حقوق کے علمبردار اور ایک غیر سرکاری تنظیم (Legal Aid for Destitute & Settlement) کے سربراہ پرویز اسلم

(Posted on March 31, 2009)

چوہدری ایڈوکیٹ کو پورا سال پولیس کی حفاظت میں رہنا پڑا کیونکہ توہین رسالت کے مقدمات میں ملزمان کا دفاع کرنے کی وجہ سے جنوری 2006ء میں ان پر حملہ کیا گیا تھا۔ اگرچہ پنجاب کے حکام نے 2007ء میں ایک نامعلوم حملہ آور کے خلاف مقدمہ درج کیا تھا لیکن پورے سال میں کوئی گرفتاری عمل میں نہ آسکی۔

این سی جے پی کے مطابق اغوا اور لڑکیوں کو زبردستی مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کرنے کے واقعات میں اضافہ ہوتا رہا۔ جولائی میں اس کمیشن نے بتایا کہ 2006ء سے اب تک 51 ہندو اور 27 عیسائی لڑکیوں کو اغوا کر کے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جا چکا ہے۔

ہندوؤں کو دھمکانے کا سلسلہ جاری رہا اور اکثر و بیشتر قانون نافذ کرنے والے اداروں کی طرف سے انھیں رشوت کے مطالبات کا سامنا کرنا پڑا آل سندھ ہندو پنچایت اور پاکستان ہندو پنچایت کے مطابق کہ سال بھر میں بیس ہندو لڑکیوں اغوا کر کے زبردستی مسلمان ہونے پر مجبور کیا گیا۔ کچھ لڑکیوں نے رہائی پانے کے لیے اسلام قبول کرنے کا تاثر دیا۔ بعض لڑکیوں کو حکام نے برآمد کر لیا لیکن سات لڑکیاں سال کے آخر تک لاپتہ رہیں۔ حکام کا موقف ہے کہ اسلام قبول کر لینے کے بعد کسی لڑکی کو اپنے غیر مسلم والدین کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ ان لڑکیوں کے اہل خانہ کا الزام ہے کہ مذہب کی تبدیلی کے بیانات حلفی جعلی تھے اس کے باوجود برآمد ہونے والی لڑکیاں ان کے والدین کے حوالے نہیں کی گئیں۔

26 فروری کو کیتھولک بشپس کانفرنس آف لاہور کے صدر آرچ بشپ لارنس سلڈینا نے بتایا کہ 2007ء کے دوران پانچ سو عیسائی خاندانوں کو انتہا پسند گروپوں کی طرف سے دھمکیاں دی گئیں یا ان کی جانوں اور عقائد کو خطرہ لاحق رہا۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ عیسائی لڑکیوں کے اغوا کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے۔

نومبر 2006ء میں چترال میں اسماعیلیوں کے ایک جماعت خانہ پر حملہ کیا گیا تھا۔ پولیس نے کسی حملہ آور کو گرفتار نہیں کیا۔

احمدی رہنماؤں نے الزام عائد کیا ہے کہ انتہا پسند سنی علماء اور ان کے معتقدین اکثر و بیشتر ربوہ کی گلیوں اور بازاروں میں جلوس نکالتے ہیں۔ ربوہ وسطی پنجاب کا ایک ایسا شہر ہے جہاں زیادہ تر احمدی آباد ہیں اور یہ شہر ان کا روحانی مرکز سمجھا جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمان علماء کے جلوسوں کے دوران پولیس بھی موجود رہتی ہے۔

احمدیوں، عیسائیوں، ہندوؤں اور شیعہ فرقے کے افراد کو یہ بھی شکایت ہے کہ سرکاری اداروں میں ملازمتوں کے حصول اور تعلیمی اداروں میں داخلے کے وقت ان کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے۔ ان تمام گروہوں کو پرتشدد کارروائیوں کا بھی سامنا رہتا ہے۔

حکومت کی ہدایت پر مذہبی اختلافات اور عبادات کے طریقہ سے متعلق حساس مواد حال ہی میں درسی کتب سے ہٹا دیا گیا ہے۔ دیگر مذاہب کے پیروکار دینیات نہ پڑھنا چاہیں تو وہ اخلاقیات کی کتاب کا انتخاب کر سکتے ہیں۔

اگرچہ پاکستان میں بہت کم یہودی شہری ہیں لیکن عام آبادی میں یہودیوں کے خلاف نفرت کے جذبات انتہا کو چھو رہے ہیں۔

اس حوالے سے مزید تفصیلات جاننے کے لیے آپ 2008ء کی انٹرنیشنل ریلیجس فریڈم رپورٹ www.State.gov/g/drl/irf/rpt پر ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

نقل و حرکت کی آزادی۔ اندرون ملک بے گھر افراد، پناہ گزینوں اور بے وطن لوگوں کا تحفظ

قانون کی رو سے ہر شہری کو ملک کے اندر سفر کرنے غیر ملکی سفر اختیار کرنے، بیرون ملک شہریت اختیار کرنے اور نقل مکانی کرنے کی آزادی کو

(Posted on March 31, 2009)

حاصل ہے تاہم حکومت نے ان حقوق کو محدود کر رکھا ہے۔ امن وامان کی صورت حال کی وجہ سے غیر ملکیوں کے لیے فاٹا، بلوچستان اور صوبہ سرحد کے بعض علاقوں میں جانے کے لیے حکومت سے خصوصی اجازت نامہ حاصل کرنا لازمی ہے۔ اسی طرح سے آزاد کشمیر جانے کے خواہشمند غیر ملکیوں کو بھی حکومت سے عدم اعتراض کا سرٹیفکیٹ NOC حاصل کرنا پڑتا ہے۔

قانون کے مطابق اسرائیل جانے پر پابندی ہے اگرچہ یہ قانون نافذ العمل نہیں ہے۔ سرکاری ملازمین اور طلباء کو بیرون ملک جانے سے پہلے عدم اعتراض کا سرٹیفکیٹ لینا پڑتا ہے یہ اور بات ہے کہ عموماً طلبہ کو پر اس پابندی کا اطلاق نہیں کیا جاتا۔

ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل کئے گئے افراد بیرون ملک کا سفر نہیں کر سکتے۔ سال کے اختتام تک کم وبیش 636 افراد کے نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل تھے۔ انسانی حقوق کے وکلاء کا کہنا ہے کہ مئی میں لاہور ہائی کورٹ کی طرف سے اس لسٹ کا جائزہ لینے کے بعد سے اس میں درج افراد کی تعداد میں خاصی کمی آئی ہے اگرچہ ایگزٹ کنٹرول لسٹ کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ جن افراد کے خلاف فوجداری مقدمات درج ہوں وہ بیرون ملک نہ جا سکیں لیکن وزارت داخلہ کی طرف سے اس لسٹ میں کسی شخص کے نام کے اندراج کے لیے کسی قانونی کارروائی کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی، اسی وجہ سے بعض اوقات قوم پرست اور حزب اختلاف کی پارٹیوں کے راہنماؤں اور انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والے افراد کو ہراساں کرنے کے لیے ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں ان کے نام شامل کر دیے جاتے ہیں۔ اس لسٹ میں شامل افراد اپنے نام خارج کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کر سکتے ہیں۔ 28 اگست کو مشیر داخلہ رحمان ملک نے اعلان کیا کہ بلوچ سیاسی راہنماؤں کے نام ای سی ایل سے خارج کر دیے گئے ہیں۔

قانون کے مطابق کسی شہری کو زبردستی بیرون ملک نہیں بھیجا جا سکتا۔ پورے سال میں اس طرح کا کوئی واقع بھی پیش نہیں آیا۔

اندرون ملک بے گھر ہونے والے افراد

اس سال صوبہ سرحد اور پنجاب کے مختلف علاقوں میں سیلاب صوبہ سرحد اور فاٹا میں فرقہ وارانہ فسادات اور فوجی کارروائیوں کے باعث اندرون ملک بے گھر ہونے والے افراد کی تعداد میں کمی بیشی ہوتی رہی۔ اقوام متحدہ کے ہائی کمیشن برائے پناہ گزین یو این ایچ سی آر کے مطابق باجوڑ میں فوجی کارروائی کے باعث ایک لاکھ نوے ہزار افراد بے گھر ہوئے جبکہ ستمبر تک سوات میں 90 ہزار افراد اپنے گھر بار چھوڑ کر دوسرے علاقوں کو جانے پر مجبور ہو چکے تھے۔ سال کے آخر تک صوبہ سرحد اور فاٹا کے تقریباً دو لاکھ افراد بے گھر تھے۔ باجوڑ اور سوات سے نقل مکانی کرنے والے بہت سے لوگ دوسرے شہروں اور علاقوں میں اپنے عزیز واقارب کے ہاں مقیم ہیں۔ اس لیے بے گھر افراد کی تعداد کا صحیح تخمینہ لگانا خاصا مشکل ہے۔ پنجاب اور سرحد میں سیلاب اور بلوچستان کے زلزلے کی وجہ سے تین لاکھ افراد بے گھر ہوئے تھے۔

باجوڑ کے اردگرد اضلاع میں حکومت نے یو این ایچ سی آر اور دیگر عالمی تنظیموں کے تعاون سے بے گھر افراد کے لیے گیارہ کیمپ قائم کیے جن میں انھیں خیمے، خوراک اور ضرورت کی مختلف اشیاء مہیا کی جا رہی ہیں۔ ان کیمپوں میں مقیم افراد کو صحت وصفائی کے حوالے سے کئی شکایات ہیں۔

ذرائع ابلاغ کی اطلاعات کے مطابق 2003ء سے اب تک مقبوضہ کشمیر سے پندرہ لاکھ کشمیری بے گھر ہو کر پاکستان آ چکے ہیں۔ قانوناً یہ تمام کشمیری پاکستان کے مکمل شہری سمجھے جاتے ہیں۔

پناہ گزینوں کا تحفظ

(Posted on March 31, 2009)

اگرچہ قانون میں پناہ گزینوں سے متعلق اقوام متحدہ کے 1951ء کے کنونشن اور 1967ء کے پروٹوکول کے مطابق کسی غیر ملکی کو سیاسی پناہ دینے یا پناہ گزین کی حیثیت دینے کی گنجائش نہیں ہے لیکن عملی اعتبار سے اکثر و بیشتر ایسے پناہ گزینوں کو جنھیں اپنے ملک میں جان کا خطرہ ہو یا جنھیں اپنے ملک سے زبردستی نکالا گیا ہو حکومت کی طرف سے تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔ پاکستان یو این ایچ سی آر کی گورننگ ایگزیکٹو کمیٹی کا رکن ہے اور افغان پناہ گزینوں کی دیکھ بھال وطن واپسی اور امداد میں یو۔این۔ایچ۔سی۔آر کے ساتھ تعاون کرتا آیا ہے۔

1979ء سے اب تک ہمسایہ افغانستان کے لاکھوں پناہ گزین پاکستان آچکے ہیں۔ نیشنل ڈیٹا بیس اینڈ رجسٹریشن اتھارٹی (نادرا) کے اعداد وشمار کے مطابق سال کے آخر تک ساڑھے اکیس لاکھ افغان پناہ گزین بدستور پاکستان میں مقیم تھے جبکہ 2002ء سے اب تک چونتیس لاکھ پناہ گزین اپنے وطن واپس جاچکے ہیں۔ اس سال کے دوران میں دو لاکھ بہتر ہزار افغان پناہ گزین یو این ایچ سی آر کی وساطت سے اپنے ملک جاچکے ہیں۔

اس وقت پاکستان میں افغان پناہ گزینوں کے اسی سے زائد کیمپ ہیں جن میں سے اکہتر صوبہ سرحد میں بارہ بلوچستان میں جبکہ ایک کیمپ پنجاب میں قائم ہے۔

علاوہ ازیں اگست میں باجوڑ میں فوجی کارروائی کے آغاز کے بعد سے اندرون ملک نقل مکانی کرنے والوں کے علاوہ بیس ہزار افراد افغانستان کے صوبہ کنڑ میں پناہ لے چکے ہیں۔

اکتوبر میں حکومت نے غیر قانونی طور پر باجوڑ مین مقیم افغان پناہ گزینوں کو اپنے وطن واپس جانے کا حکم دیا اور ساتھ ہی اس حکم پر عمل درامد نہ کرنے والے افغان پناہ گزینوں کو زبردستی نکالنے اور گرفتار کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر دیا گیا۔ پاکستان کے سیکورٹی حکام نے اکتوبر میں بتایا کہ سینکڑوں جنگجو پاکستان کے اندر حملے کرنے کے لیے افغانستان سے آتے جاتے رہتے ہیں۔

پولیس اکثر افغان پناہ گزینوں سے رشوت لیتی ہے اور مصدقہ اطلاعات کے مطابق انٹیلی جینس ایجنسیوں کے لوگ افغان پناہ گزینوں کو ہراساں کرنے میں ملوث ہیں۔ مختلف این جی اوز میں ملازمت کرنے والی خواتین پناہ گزینوں کو طالبان کے حامی اپنے ہم وطنوں کی طرف سے ہراساں کیا جاتا ہے۔ مقامی باشندوں کو شکایت ہے کہ افغان پناہ گزین ان کے روزگار کے مواقع پر قابض ہو جاتے ہیں اور سنگین جرائم میں بھی ملوث ہیں اسی بناء پر افغان مہاجرین کو امتیازی سلوک کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور انھیں حقارت کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔

اگرچہ پناہ گزین عدالتوں سے رجوع نہیں کر سکتے تاہم حکومت خصوصاً افغان پناہ گزینوں کو تعلیم اور صحت کی بنیادی سہولتیں کسی حد تک فراہم کرتی ہے۔ یو این ایچ سی آر کے مطابق اس وقت پاکستان میں 478 پناہ گزین غیر افغانی ہیں جو پناہ گزین یو این ایچ سی آر اور سرکاری کمشنریٹ فار افغان ریفوجیز میں اپنی رجسٹریشن کرا لیتے ہیں انھیں بعض کوائف مکمل کرنے کے بعد سرکاری تعلیمی اداروں میں داخلہ لینے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ تنہا رہنے والی خواتین، مردوں کے بغیر رہنے والے گھرانوں کی خواتین اور گلی کوچوں میں کام کرنے والے بچوں کو اکثر زیادتی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ بعض اوقات انھیں اغوا کر کے آگے بیچ بھی دیا جاتا ہے۔

سیاسی حقوق کا احترام/عوام کا حکومت تبدیل کرنے کا اختیار

قانون ملک کے شہریوں کو اختیار دیتا ہے کہ وہ کثرت رائے سے حکومت تبدیل کر سکیں۔ اس سال منعقد ہونے والے عام انتخابات میں حزب اختلاف کی جماعتوں کو اقتدار میں آنے کا موقع ملا ہے۔ وفاق کے زیر انتظام شمالی علاقہ جات، فاٹا اور آزاد کشمیر میں منفرد نظام ہے۔ صدر مملکت کو آئین

(Posted on March 31, 2009)

کے آرٹیکل 2-58بی کے تحت پارلیمنٹ کو تحلیل کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

گلگت اور بلوچستان میں آباد شمالی علاقہ جات کے باشندوں کو قومی پارلیمنٹ میں کوئی نمائندگی حاصل نہیں ہے۔ایک سرکاری افسران علاقوں کا انتظام چلاتا ہے۔شمالی علاقہ جات کی منتخب قانون ساز کونسل مشاورت کے فرائض سرانجام دیتی ہے اور اسے قانون سازی کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔حکومت 1994ء کے لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت شمالی علاقہ جات کا نظام چلاتی ہے اور آئی سی جی کے مطابق حکومت اس علاقے کے عوام کو اس کے سیاسی اور شہری حقوق سے محروم رکھ کر اس خطے پر اپنے کنٹرول کو مضبوط کرنے کے لیے اسی حکمنامے کو استعمال کر رہی ہے۔

قبائلی علاقوں کے باشندوں کو پارلیمنٹ میں ضرورت سے زیادہ نمائندگی کا حق تو حاصل ہے لیکن اپنے علاقوں کے بارے میں فیصلہ سازی میں وہ کوئی کردار ادا نہیں کر سکتے کیونکہ یہ اختیارات صدر مملکت کے پاس ہیں۔اگر چہ قبائلی علاقوں میں مقامی حکومتوں کا نظام 2007ء میں متعارف کرایا گیا اور کونسلیں بھی منتخب کی گئی لیکن عملی طور پر تمام تر انتظام غیر منتخب سرکاری افسر چلاتے ہیں۔فاٹا پر پولیٹیکل پاٹیز ایکٹ کا اطلاق بھی نہیں ہوتا۔کوئی بھی سیاسی پارٹی قانوناً فاٹا میں نہ کوئی اپنا دفتر قائم کر سکتی ہے اور نہ ہی کوئی سیاسی مہم چلا سکتی ہے یہ اور بات ہے کہ جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام جیسی مذہبی سیاسی جماعتیں قبائلی علاقوں میں کھلم کھلا اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔

ہیومن رائٹس واچ کی 2006ء کی رپورٹ کے مطابق آزاد کشمیر کا اپنا آئین ہے جس کے تحت وہاں ایک قانون ساز اسمبلی قائم ہے اور وزیراعظم کام کر رہا ہے لیکن پاکستان کے ساتھ کشمیر کے الحاق کی مخالفت کرنے والی پارٹیوں یا افراد کو انتخاب میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دی جاتی۔آزاد کشمیر کے معاملات چلانے میں وفاقی حکومت کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔کشمیر کے آئین کی رو سے 52 اہم امور کے حوالے سے فیصلہ سازی کے اختیارات اسلام آباد میں قائم آزاد کشمیر کونسل کے پاس ہیں جو کہ وفاقی حکومت کی نگرانی اور سرپرستی میں کام کرتی ہے اس کے علاوہ آزاد کشمیر کی قانون ساز اسمبلی کو تحلیل کرنے کا اختیار بھی وفاقی حکومت کے پاس ہے۔

انتخابات اور سیاسی شراکت

18 فروری کو ملک میں عام انتخابات منعقد ہوئے جن کے نتیجے میں حزب اختلاف کی جماعتوں نے پیپلز پارٹی کی قیادت میں آپس میں اتحاد کر کے حکومت بنائی اور پیپلز پارٹی ہی کے سید یوسف رضا گیلانی وزیراعظم بنے۔یہ انتخابات منعقد ہونے سے پہلے کئی بار ملتوی ہوئے. آخری بار کا التوا 27 دسمبر 2007ء کو پاکستان پیپلز پارٹی کی چیئر پرسن بے نظیر بھٹو کے قتل کی وجہ سے کیا گیا تھا۔چھ ستمبر کو بالواسطہ صدارتی انتخاب میں بے نظیر بھٹو مرحومہ کے شوہر آصف علی زرداری پرویز مشرف کی جگہ صدر منتخب ہوئے۔جو 18 اگست کو مستعفی ہو گئے تھے۔پی پی پی اور اس کی اتحادی جماعتوں نے چار میں سے تین صوبوں میں اور مرکز میں اپنی حکومتیں قائم کر لی تھیں جبکہ پنجاب میں پاکستان مسلم لیگ (ن) نے اقتدار حاصل کر لیا تھا۔ابتداء میں مسلم لیگ (ن) اور پاکستان پیپلز پارٹی نے وفاق کی سطح پر مل کر حکومت تشکیل دی تھی لیکن معزول ججوں کو ایمرجنسی کے نفاذ پہلے والی پوزیشن پر بحال کرنے کے مطالبے کو نظر انداز کئے جانے پر مسلم لیگ (ن) وفاقی حکومت سے 25 اگست کو الگ ہو گئی تھی۔

فروری کے عام انتخابات کا جائزہ لینے والے بین الاقوامی اور ملکی مبصرین کے مطابق انتخابی عمل میں بعض کمزوریوں کے باوجود یہ انتخابات صاف ستھرے تھے اور نتائج عام ووٹروں کی خواہشات کی عکاسی کرتے تھے،حکومت نے تمام سیاسی پارٹیوں کو انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت دی تھی۔تمام بڑی سیاسی پارٹیوں نے انتخابی عمل میں بھرپور حصہ لیا لیکن پاکستان تحریکِ انصاف کچھ بلوچ قوم پرست پارٹیوں اور متحدہ مجلس عمل میں شریک کئی

(Posted on March 31, 2009)

پارٹیوں نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔

ووٹ درج کرانے والوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے مذہب کے بارے میں صراحت سے بتائیں۔ یورپین الیکشن آبزرویشن کے مطابق احمدی برادری نے انتخاب کا بائیکاٹ کیا کیونکہ ان پر لازم تھا کہ وہ اپنے ووٹ الگ سے درج کرائیں۔

سول سوسائٹی کی تنظیموں کے اتحاد نے جسے فری اینڈ فیئر الیکشن نیٹ ورک FAFEN کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ انتخابات سے پہلے پورے ملک میں جاگیرداروں اور سیکورٹی اداروں کی طرف سے ووٹروں اور سیاسی پارٹیوں کو ڈرانے دھمکانے کے واقعات کے شواہد اکٹھے کیے۔ پولیس نے خاص طور پر مختلف مقامات پر تمام ووٹروں اور سیاسی کارکنوں کو جھوٹے مقدمات میں ملوث کرنے کی دھمکیاں دیں اور انہیں جلسے جلوس منعقد کرنے سے نہ صرف روکا بلکہ مسلم لیگ (ق) کے حق میں ووٹ دینے پر مجبور بھی کیا۔ بعض مقامات پر امیدواروں کو دستبردار کرانے کے لیے انٹیلی جینس حکام نے دباؤ ڈالا۔

انتخابات والے دن بعض ووٹروں کو ووٹ دینے سے زبردستی محروم رکھا یا انہیں دھمکایا گیا۔ صوبہ سرحد اور فاٹا میں چار پولنگ سٹیشنوں پر جبکہ صوبہ سندھ میں ایک پولنگ سٹیشن پر خواتین کو ووٹ پول کرنے نہیں دیئے گئے۔ اکثر مقامات پر ووٹر خواتین کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ پورے ملک میں خواتین کے ڈالے گئے ووٹوں کا تناسب خاصا کم رہا۔

الیکشن کمیشن نے تقریباً پچیس ہزار مقامی مبصرین کو اجازت نامے جاری کئے تھے ان میں زیادہ تر کا تعلق FAFEN سے تھا۔ انتخابات کا جائزہ لینے کے لیے آنے والے غیر ملکی مبصرین کی ٹیمیں یورپین یونین اور ڈیماکریسی انٹرنیشنل کی طرف سے بھیجی گئی تھیں۔ انتخابات کے حوالے سے ملک کی تاریخ میں پہلی بار ستمبر میں الیکشن کمیشن نے پولنگ سٹیشنوں پر اعلان کردہ نتائج کی مصدقہ نقول جاری کیں۔ یہ شفاف انتخابات کے انعقاد میں ایک اہم پیش رفت ہے۔

بے نظیر بھٹو مرحومہ اور دیگر اہم راہنماؤں پر خودکش حملوں کے تناظر میں وزارت داخلہ نے سیاسی اجتماعات پر انتخابات کے ضابطہ اخلاق کے مطابق پہلے سے عائد پابندیوں کے علاوہ بھی بعض قدغنیں لگائی تھیں۔

انٹرنیشنل فاونڈیشن فار الیکٹرول سسٹمز IFES کے مطابق ہائی کورٹس میں چیلنج کئے گئے متنازعہ انتخابی نتائج کے حوالے سے فیصلے بروقت نہیں کئے جا سکے۔

لاہور ہائی کورٹ کے الیکشن ٹریبونل میں مسلم لیگ (ن) کے راہنماؤں نواز شریف اور شہباز شریف کی بالترتیب قومی اور صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لینے کی اہلیت کو چیلنج کیا گیا تھا۔ الیکشن ٹریبونل نے فیصلہ دیا کہ شہباز شریف عارضی طور پر وزیر اعلیٰ کے طور پر کام کر سکتے ہیں جبکہ نواز شریف کے حوالے سے ٹریبونل نے فیصلہ کرنے کے لیے مقدمہ سپریم کورٹ کے سپرد کر دیا۔ یہ مقدمہ 2000ء میں بدعنوانی اور طیارے کو اغوا کرنے کے جرم میں سزا سنائے جانے کی بنیاد پر دائر کیا گیا تھا جس میں کہا گیا کہ وہ کسی انتخاب میں حصہ نہیں لے سکیں گے۔ سال کے آخر تک ان دونوں مقدمات پر سپریم کورٹ فیصلہ نہ کر سکی۔

342 اراکین پر مشتمل قومی اسمبلی میں 60 نشستیں خواتین کے لیے مخصوص ہیں ان کے علاوہ 16 خواتین عام نشستوں پر بھی انتخاب جیت کر اسمبلی پہنچی ہیں۔ وفاقی کابینہ میں پانچ خواتین کو شامل کیا گیا ہے ملک کی تاریخ میں پہلی بار ایک خاتون ڈاکٹر فہمیدہ مرزا کو قومی اسمبلی کا سپیکر منتخب کیا گیا۔ ملک کی چاروں صوبائی اسمبلیوں کی 758 نشستوں میں سے 128 خواتین کے لیے مخصوص ہیں۔ مقامی حکومتوں کے نظام میں ایک تہائی نشستیں

(Posted on March 31, 2009)

خواتین کے لیے مختص ہیں۔صوبائی وزراء اعلیٰ نے بھی وزراء کے طور پر کئی خواتین کو اپنی ٹیم میں شامل کیا تاہم بعض جگہوں پر کچھ مذہبی اور سماجی قدامت پسند گروہوں نے خواتین کو امیدوار بننے سے روکا تھا۔

قومی اسمبلی میں اقلیتوں کے لیے دس نشستیں ہیں جبکہ ایک اقلیتی رکن اسمبلی وفاقی وزیر برائے اقلیتی امور مقرر کئے گئے ہیں۔خواتین کے لیے تمام مخصوص نشستیں قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں سیاسی پارٹیوں میں عام انتخابات میں حاصل ہونے والی نشستوں کی بنیاد پر تقسیم کی جاتی ہیں۔چاروں صوبائی اسمبلیوں میں اقلیتوں کے لیے تیئس نشستیں مخصوص ہیں ان میں سے پنجاب اسمبلی میں آٹھ سندھ اسمبلی میں نو بلوچستان اور سرحد اسمبلی میں تین تین نشستیں اقلیتی اراکین کے لیے ہیں۔

سرکاری سطح پر بدعنوانی اور شفافیت

قانون کے مطابق سرکاری حکام کی بدعنوانی پر سخت سزا دی جاسکتی ہے لیکن عملی طور پر حکومت نے یہ قانون نافذ نہیں کیا۔اسی لیے سرکاری ملازمین اور افراد بلا جھجک رشوت لیتے ہیں اور رائے عامہ کا بھی یہی خیال ہے کہ مالی بدعنوانی اور رشوت ستانی کی جڑیں بہت مضبوط ہو چکی ہیں۔

نیب کی طرف سے قائم کئے گئے بدعنوانی اور بااثر افراد کی طرف سے قرضے واپس نہ کرنے کے مقدمات کی سماعت خصوصی احتساب عدالتوں میں کی جاتی ہے۔نیب کاروبار میں نقصان اُٹھانے والوں اور چھوٹے ڈیفالٹرز کے خلاف کاروائی نہیں کرتا،احتساب عدالتوں کو مقدمات کے فیصلے ایک ماہ کے اندر اندر کرنا ہوتے ہیں جو اکثر نہیں ہو پاتے۔احتساب عدالتوں میں ملزم کو قصوروار تصور کیا جاتا ہے۔

عالمی بینک کے ورلڈ وائیڈ گورنس انڈیکیٹرز سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان میں بدعنوانی ایک سنگین مسئلہ بن چکا ہے۔

19 ستمبر کو منتخب حکومت نے قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف کو قومی اکاونٹس کمیٹی کا سربراہ بنایا۔یہ کمیٹی وفاقی حکومت کے اخراجات پر نظر رکھنے کی ذمہ دار ہے۔

اکتوبر 2007ء میں حکومت این آر او (National Reconciliatory Ordinance) جاری کیا جس میں عوامی عہدوں پر فائز افراد کے خلاف سیاسی بنیادوں قائم مقدمات ختم کرنے کا طریقہ کار وضع کیا گیا تھا۔اسی آرڈیننس کے تحت نیب سے بدعنوانی کے جرم میں سزا یافتہ افراد کو دس سال تک کوئی عوامی عہدہ سنبھالنے کا نااہل قرار دیا گیا تھا۔این آر او کو سندھ ہائیکورٹ اور سپریم کورٹ میں چیلنج کیا گیا۔حکومت نے یہ موقف اختیار کیا کہ یہ آرڈیننس قومی یکجہتی اور مفاہمت اور سیاسی پارٹیوں کے درمیان ہم آہنگی کے فروغ کے لیے جاری کیا گیا ہے۔اس آرڈیننس کے مطابق کسی منتخب رکن کو گرفتار نہیں کیا جاسکتا۔اگر کسی رکن اسمبلی کے خلاف الزامات عائد کئے جائیں تو ایک پارلیمانی کمیٹی ان الزمات کا جائزہ لے گی۔وہ اس مقدمے کو درج کرنے یا خارج کرنے کا فیصلہ کرے گی۔سول سوسائٹی اور سیاسی مبصرین کے مطابق یہ اقدام ایک اور مراعات یافتہ طبقہ پیدا کرنے کے مترادف ہے۔2007ء اختتام تک سپریم کورٹ نے این آر او کے حوالے سے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

نیب نے اپریل میں اپنے انٹی کرائم اینڈ اکنامک ونگ کو ایف آئی اے کے سپرد کرنے کے بعد سے بڑے پیمانے پر حزب اختلاف کے سیاستدانوں کو نشانہ بنانے کا سلسلہ ختم کردیا ہے۔فیڈرل انوسٹی گیشن ایجنسی ایف آئی اے وزارت داخلہ کے تحت کام کرتی ہے۔جنرل مشرف نے 2002ء میں یہ ونگ ایف آئی اے سے نیب کو منتقل کردیا تھا۔نیب کسی حاضر سروس فوجی افسر کے خلاف بھی کوئی کارروائی نہیں کرسکتا۔

(Posted on March 31, 2009)

فریڈم آف انفارمیشن آرڈیننس اطلاعات اور معلومات تک شہریوں کی رسائی کو محدود کرنا ہے۔

انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی عالمی اور غیر سرکاری سطح پر تحقیقات کے حوالے سے حکومت کا رویہ

عام طور پر انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے کام کرنے والی کئی مقامی اور عالمی تنظیمیں کسی پابندی کے بغیر تحقیقات کرتی اور انسانی حقوق کے حوالے سے اپنی رپورٹیں شائع کرتی ہیں۔ نئی انتظامیہ کے حکام عام طور پر ان تنظیموں کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔

حکومت کی خواہش ہے کہ انسانی اسمگلنگ کی روک تھام، انتخابات کے عمل، ماحول کے تحفظ، ترقی اور آفات کی صورت میں امدادی سرگرمیوں میں مقامی اور عالمی این جی اوز سے تکنیکی معاونت حاصل کرے۔ انسانی حقوق کی تنظیمیں تھانوں اور جیلوں کی صورت حال پر بھی آسانی سے نظر رکھ سکتی ہیں۔

اس سال کے دوران میں HRCP نے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی تحقیقات جاری رکھی اور انسانی حقوق کے مختلف موضوعات پر مذاکرے منعقد کرنے میں معاونت کی۔ نومبر میں HRCP نے اطلاع دی کہ این جی اوز کو انتہا پسند جنگجوؤں کی طرف سے خاص طور پر پشاور میں دھمکیاں مل رہی ہیں۔

حکومت نے انسانی حقوق کے غیر سرکاری مبصرین کو ملک کا دورہ کرنے کی اجازت دی اور اس شعبہ میں کام کرنے والی تنظیموں کے ساتھ پورا تعاون کیا۔ ICRC,UNHCR,UNICEF اور UNDP سمیت اقوام متحدہ کے کئی اداروں کے دفاتر ملک میں کام کر رہے ہیں۔

3 نومبر کو حکومت نے انسانی حقوق کی نئی وزارت بنائی۔ اس سے پہلے یہ شعبہ وزارت قانون وانصاف کے سپرد تھا۔ سینٹ اور قومی اسمبلی کی قانون، انصاف اور انسانی حقوق کی قائمہ کمیٹیوں نے توہین کے قانون میں پولیس کی زیادتیوں، غیرت کے نام پر ہونے والے جرائم اور حدود آرڈیننس سمیت کئی امور پر غور وفکر کیا۔ ان مسائل کے حوالے سے عوام میں شعور بیدار کرنے کے لیے یہ کمیٹیاں ایک اچھا فورم ثابت ہو رہی ہیں لیکن ان کی کارروائیاں عام طور پر سرکاری پالیسی تک محدود رہتی ہیں۔ علاوہ ازیں عملی اعتبار سے یہ کمیٹیاں وسائل کی کمی کے باعث ان امور پر محض آنکھیں بند کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتیں۔ مختلف پارٹیوں کے اراکین پر مشتمل انسانی حقوق کے پارلیمانی کمیشن نے بہت سے اہم امور پر موثر کردار ادا کیا ہے۔

امتیازی سلوک، سماجی ناانصافیاں اور انسانی اسمگلنگ

آئین کی رو سے تمام شہری برابر ہیں کسی کے ساتھ رنگ، نسل، مذہب، رہائش اور جائے پیدائش کی بنیاد پر امتیازی سلوک نہیں کیا جا سکتا تاہم عملی اعتبار سے ان میں سے تمام عوامل کی بناء پر واضح امتیاز برتا جاتا ہے۔

خواتین

جیون ساتھ کے سوا شادی سے باہر جنسی تعلقات قائم کرنا ایک سنگین جرم ہے۔ کسی کو اپنی بیوی یا رخصتی کے بغیر اپنی منکوحہ کے ساتھ ازدواجی تعلقات قائم کرنے پر مجرم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگرچہ عصمت دری کے واقعات عام ہیں لیکن اس حوالے سے بہت کم مقدمات درج ہوتے ہیں۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق سماجی مجبوریوں اور سنگین نتائج کے پیش نظر عصمت دری کے دس فیصد سے بھی کم واقعات کی پولیس میں رپورٹ درج کرائی جاتی ہے۔ خواتین کے ساتھ اس طرح کی زیادتیوں پر نظر رکھنے کا کام وزارت ترقی نسواں، سماجی بہبود اور خصوصی تعلیم این جی اوز کے تعاون سے کرتی ہے۔

(Posted on March 31, 2009)

تحفظ خواتین ایکٹ مجریہ 2006ء کی رو سے عصمت دری کا جرم اسلامی عدالتوں سے فوجداری عدالتوں کو منتقل کیا جا چکا ہے اس سے پہلے حدود آرڈیننس کے تحت عصمت دری کی شکایت کرنے والی خاتون کو اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لیے چار مرد گواہ عدالت میں پیش کرنا ہوتے تھے۔ نئے قانون کے مطابق اب پولیس کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ وہ سول جج کی اجازت کے بغیر کسی عورت کو رات کے وقت تھانے میں رکھ سکے۔ عصمت دری جیسے گھناؤنے جرم سے متاثرہ خواتین کو تھانوں میں پیش آنے والی مشکلات سے بچانے کے لیے اس ایکٹ کے تحت یہ مقدمات سیشن جج کی عدالت میں پیش کئے جاتے ہیں۔ تاہم خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے والی این جی اوز کو شکایت ہے کہ نئے قانون کے مطابق استطاعت اور عدالت تک رسائی نہ رکھنے والی خواتین کے لیے کئی رکاوٹیں پیدا کر دی گئی ہیں۔ اب عدالتوں میں عصمت دری کے مقدمات کی سماعت حدود آرڈیننس کے بجائے تحفظ خواتین ایکٹ کے تحت کی جا رہی ہے تاہم خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے والی تنظیموں کا کہنا ہے کہ نیا قانون پوری طرح سے نافذ نہیں کیا گیا۔

عصمت دری کے جرم کی سزا دس سے 25 سال تک قید اور جرمانے سے لیکر سزائے موت تک ہے۔ اجتماعی زیادتی کی سزا عمر قید یا موت ہے لیکن عام طور پر سزا کا دورانیہ کم رہتا ہے۔

عصمت دری کے واقعات کی رپورٹنگ صحیح طور پر نہ ہونے کے باعث قومی سطح پر اس جرم کے ارتکاب کے مصدقہ اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔ مقامی مبصرین کا کہنا ہے کہ پاکستان میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں میں عصمت دری کا جرم سب سے زیادہ گھناؤنا ہے۔

بعض اوقات پولیس بھی عصمت دری کے مقدمات میں ملوث ہو جاتی ہے۔ ملزمان سے رشوت لے کر کیس کمزور کر دیا جاتا ہے اور متاثرہ خواتین کو ڈرایا دھمکایا جاتا ہے یا ان کے ساتھ زیادتی کی کوشش کی جاتی ہے اس کے علاوہ متاثرین سے مقدمہ درج کرنے کے لیے رشوت بھی مانگی جاتی ہے۔ این جی اوز کے مطابق بعض پولیس سٹیشنوں پر سرے سے عصمت دری کے مقدمات درج ہی نہیں کئے جاتے۔ طبی عملے کی ناکافی فارنزک تربیت ہونے کے باعث بھی بہت سے مقدمات الجھ جاتے ہیں۔

مارچ کے اوائل میں ایک سترہ سالہ لڑکی تسلیم سولنگی کو مبینہ طور پر ایک جرگے نے غیرت کے نام پر قتل کرنے کا حکم دیا۔ AHRC کے مطابق اس لڑکی کو پہلے کتوں نے بھنبھوڑا اور بعد میں اس کے شوہر کے خاندان والوں نے اسے قتل کر دیا۔ 23 دسمبر کو صدر زرداری نے اس واقعے کی تحقیقات کے لیے ایک جج کو انکوائری افسر مقرر کیا۔

وارا گینسٹ ریپ نامی این جی او کے مطابق کراچی میں 15 مارچ کو قائداعظم کے مزار پر سیر کے لیے آنے والی ایک انیس سالہ نو بیاہتا لڑکی کو پانچ افراد نے گن پوائنٹ پر چھتیس گھنٹوں تک اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا۔ اپریل میں ڈی این اے ٹیسٹ کے ذریعے ایک مشتبہ ملزم سید خادم حسین کی شناخت اور تصدیق ہو گئی۔ سال کے آخر تک تین ملزمان جیل سے اپنا مقدمہ لڑتے رہے اور 22 نومبر کو عدالت نے ان کی درخواست ضمانت خارج کر دی۔

26 مئی کو لاہور کے علاقے گوالمنڈی میں ایک سات سالہ بچی کو زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔ ملزموں میں ایک اس کا چچا تھا دونوں افراد کے خلاف مقدمہ بدستور چل رہا ہے۔

24 اگست کو راولپنڈی میں کچھ افراد نے ایک تیرہ سالہ طالبہ کو اغوا کر کے زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد قتل کر دیا۔ سال کے آخر تک کوئی گرفتاری نہیں ہو سکی تھی۔

10 ستمبر کو حکام نے منڈی بہاوالدین میں صائمہ نامی ایک خاتون کے اغوا زیادتی اور قتل کے مقدمے کے تفتیشی افسر کو معطل کر کے اعلیٰ سطح کی

(Posted on March 31, 2009)

تحقیقات کا حکم دیا۔حملہ آوروں نے اسے قتل کرنے سے پہلے اس پر تیزاب بھی ڈالا تھا۔اس کے اہل خانہ کی درخواست کے باوجود پولیس نے سرکاری تحقیقات شروع نہیں کی تھی۔تاہم ملزمان کی طرف سے قتل کی دھمکیوں پر اس کے خاندان والوں کو پولیس کا تحفظ فراہم کیا گیا۔

شاہدرہ لاہور میں جنوری 2007ء میں ایک سترہ سالہ لڑکی کو چار افراد نے اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا اس مقدمے میں کوئی گرفتاری نہیں ہوسکی۔

جنوری 2007ء میں حیدرآباد میں سولہ سالہ نسیمہ لبانو کو آٹھ افراد نے اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا اور اسے اپنے گاؤں حبیب لبانو میں ننگی حالت میں گلیوں میں چلنے پر مجبور کیا۔اس کو یہ سزا اس لیے دی گئی تھی کہ اس کا چچازاد بھائی ایک دوسرے قبیلے کی عورت کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔نسیمہ اس جرم کے نتیجے میں حاملہ ہوگئی۔ابتدائی ہچکچاہٹ کے بعد پولیس نے مارچ 2007ء میں چھ ملزمان کو جبکہ جولائی میں دو مزید ملزمان کو گرفتار کیا۔اس کے خاندان والوں کو اپنی سلامتی کے خوف سے گاؤں چھوڑنا پڑا۔

2002ء میں مختاراں مائی کے ساتھ ہونے والے گینگ ریپ کے سپریم کورٹ میں زیر سماعت مقدمے میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی 2005ء سپریم کورٹ نے حکم دیا تھا کہ اس جرم میں ملوث پانچ افراد کو دوبارہ گرفتار کیا جائے اور انھیں ضمانت پر بھی رہا نہ کیا جائے ان افراد کو لاہور ہائی کورٹ نے رہا کر دیا تھا۔اس سال کے دوران مختاراں مائی جنوبی پنجاب میں واقع اپنے گاؤں میں پولیس کی حفاظت میں رہائش پذیر رہی اور اس کے گینگ ریپ میں ملوث تیرہ افراد جیل میں بند رہے۔

2005ء کے ڈاکٹر شازیہ خالد کے ساتھ سوئی گیس فیلڈ بلوچستان میں ہونے والی زیادتی کے مقدمے میں بھی پورا سال کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔بلوچ قوم پرستوں کا دعویٰ ہے کہ ڈاکٹر شازیہ خالد کو فرنٹیئر کور کے اہل کاروں نے زیادتی کا نشانہ بنایا جبکہ حکومت کا موقف ہے کہ ڈی این اے ٹیسٹ سے اس دعویٰ کی تصدیق نہیں ہوسکی۔ایک قبائلی جرگے نے ڈاکٹر شازیہ کو قبیلے کو بدنام کرنے کے جرم میں سزائے موت سنائی۔شازیہ 2005ء میں اپنے شوہر کے ہمراہ بیرون ملک منتقل ہوگئی۔انسانی حقوق کی تنظیموں کا دعویٰ ہے کہ وہ حکومت کے دباؤ پر ملک سے باہر گئے ہیں۔

گھریلو تشدد بڑے پیمانے پر ہوتا رہا، جو ایک سنگین مسئلے کی حیثیت رکھتا ہے۔شوہروں نے اپنی بیویوں کو زدوکوب کیا اور بعض صورتوں میں قتل بھی کر ڈالا۔گھریلو تشدد کے جو دوسرے واقعات ہوئے،ان میں بیویوں کو اذیتیں دینا،ان کی چٹیا کاٹ ڈالنا اور سسرال والوں کی طرف سے خواتین سے بدسلوکی اور انھیں ہراساں کرنے جیسے واقعات شامل ہیں۔کم جہیز لانے کی وجہ سے اور دوسرے خاندانی تنازعات کے باعث خواتین کو قتل کیا گیا یا انھیں آگ لگا کر یا ان پر تیزاب پھینک کر ان کا چہرہ مسخ کر دیا گیا۔

گھریلو تشدد روکنے کے لئے کوئی مخصوص قانون نہیں البتہ اس مقصد کے لئے ضابطہ تعزیرات کی دفعات کو استعمال کیا جاتا ہے۔خواتین کی حیثیت کے بارے میں قومی کمیشن نے،جو کہ ایک سرکاری ادارہ ہے،گھریلو تشدد کے خلاف قانون منظور کرنے پر زور دیا۔

پاکستان کے انسانی حقوق کمیشن نے جون میں اپنی رپورٹ میں بتایا کہ پنجاب کے دیہی علاقوں کی 80 فیصد شادی شدہ خواتین کو اپنے شوہروں کی طرف سے تشدد کا خطرہ تھا،جبکہ نہایت ترقی یافتہ شہری علاقوں میں تقریباً 50 فی صد خواتین نے بتایا کہ ان کے شوہر انھیں مارتے پیٹتے ہیں۔نومبر تک چولھے پھٹنے کے واقعات میں 21 خواتین کی ہلاکت کی اطلاع ملی۔اس قسم کے واقعات میں خواتین پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگائی جاتی ہے،لیکن بتایا یہ جاتا ہے کہ یہ آگ چولھا پھٹنے سے لگی ہے۔پروگریسو ویمن ایسوسی ایشن کے مطابق اس طرح کے کئی واقعات کی اطلاع ہی نہیں دی جاتی۔

جو خواتین گھریلو تشدد کے بارے میں رپورٹ درج کرانے کی کوشش کرتی ہیں،انھیں طرح طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔گھریلو تشدد کے خلاف مخصوص قانون نہ ہونے کے باوجود ملزمان پر فرد جرم عائد کی جاسکتی ہے،لیکن تشدد کا شکار ہونے والی بہت کم خواتین نے مقدمات درج کرائے۔

(Posted on March 31, 2009)

پولیس اور ججوں نے گھریلو تشدد کے واقعات کو گھریلو مسائل سمجھتے ہوئے کسی قسم کی کارروائی کرنے میں تامل سے کام لیا۔ پولیس نے اس طرح کے واقعات میں مقدمہ درج کرنے کے بجائے اکثر فریقین کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ صلح کر لیں۔ اکثر صورتوں میں ایسا ہوا کہ جن خواتین پر تشدد ہوا تھا، انھیں واپس انہی خاندان والوں کے حوالے کر دیا گیا، جو تشدد کے ذمہ دار تھے۔ خواتین نے اس طرح کے واقعات کے خلاف مقدمات کی پیروی سے گریز کیا، کیونکہ وہ طلاق کی بدنامی سے ڈرتی ہیں۔ اس کے علاوہ انھیں مالی اور نفسیاتی طور پر رشتہ داروں پر بوجھ بننا پڑتا ہے۔ ایسی خواتین کے رشتہ داروں نے بھی رپورٹ درج کرانے سے گریز کیا تا کہ خاندان کی بدنامی نہ ہو۔

حکومت نے مصیبت زدہ خواتین کے لئے کرائسس سنٹر کھول رکھے ہیں۔ ان سنٹرز نے ظلم اور زیادتی کا شکار ہونے والی خواتین کی مدد کے لئے این جی اوز سے رجوع کیا۔ مصیبت زدہ خواتین کے لئے ضلع کی سطح پر 70 پناہ گاہیں یا شیلٹر ہوم اور تقریباً 250 دوسرے مختلف مراکز نے کام جاری رکھا۔ ان میں زنانہ پولیس اسٹیشن اور سماجی بہبود کے صوبائی محکموں کے مراکز شامل ہیں۔ ضلعی مراکز نے مصیبت زدہ خواتین کے لئے پناہ، علاج، محدود حد تک قانونی امداد اور بعض تربیتی سہولتوں کا انتظام کیا۔

حکومت کے زیر انتظام چلنے والے شیلٹر ہومز میں خواتین سے زیادتی ہونے کے بعض واقعات بھی ہوئے۔ اسلام آباد، لاہور اور ملتان میں ایک ایک اور کراچی میں دو غیر سرکاری شیلٹر ہومز کام کر رہے ہیں۔

فروری 2007 میں ایک شخص نے اپنے دو بھائیوں کی مدد سے راولپنڈی میں اپنی 21 سالہ بیوی کو آگ لگا دی تھی، اس کیس میں کوئی پیشرفت نہیں ہوئی۔ 2007 کے اواخر میں پولیس نے اس شخص کو اس کے ایک بھائی سمیت قتل کے الزام میں راولپنڈی کے قریب سے گرفتار کر لیا تھا، جبکہ دوسرا بھائی دبئی فرار ہو گیا تھا۔ سال کے اختتام تک یہ کیس راولپنڈی ڈسٹرکٹ کورٹ میں زیر التوا تھا۔ پروگریسو ویمن ایسوسی ایشن کے مطابق آگ سے ہلاک ہونے والی خاتون کے رشتہ داروں پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ معاوضہ لے کر مقدمہ واپس لے لیں مگر انھوں نے انکار کر دیا۔

زیر نظر سال کے دوران ملک بھر میں غیرت کے نام پر قتل کرنے اور اعضا مسخ کرنے واقعات بھی ہوئے۔ اس طرح کے بعض واقعات میں مرد بھی قتل ہوئے، لیکن زیادہ تر واقعات میں عورتوں کو قتل کیا گیا۔ اس طرح کے واقعات کے بارے میں اعداد و شمار زیادہ قابل اعتماد نہیں، کیونکہ کئی واقعات کی اطلاع ہی نہیں دی جاتی۔ جنوری اور مئی کے درمیان 476 خواتین کے قتل کی اطلاع ملی۔

2005 میں غیرت کے نام پر قتل کے خلاف قصاص اور دیت کا قانون بنایا گیا تھا، تاہم انسانی حقوق کی تنظیمیں اس قانون پر تنقید کرتی ہیں کیونکہ اس میں متاثرہ فریق یا اس کے ورثا کو اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ انتقام یا معاوضہ لے کر معاملہ ختم کر سکتے ہیں۔ غیرت کے نام پر زیادہ تر جرائم خاندانوں کے اندر ہوئے، اس لئے ملزمان نے اکثر صورتوں میں معمولی معاوضہ دے کر اپنے آپ کو قرار واقعی سزا سے بچا لیا۔

جولائی میں بابا کوٹ، بلوچستان میں کچھ لوگوں نے دو لڑکیوں اور تین خواتین کو گولی مار کر قتل کر دیا اور ان کی لاشیں گڑھے میں دبا دیں۔ یہ لڑکیاں اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتی تھیں اور خواتین نے ان کو تحفظ دیا تھا۔ یہ واقعہ خاص طور پر اس وقت خبروں کا موضوع بنا اور سیاستدانوں اور انسانی حقوق کی تنظیموں نے تنقید کی، جب ایک بلوچ رہنما سینیٹر اسرار اللہ زہری نے قتل کو درست قرار دیا اور کہا یہ صدیوں پرانی روایت ہے۔ دو مہینے بعد حکومت نے انھیں پوسٹل سروسز کا وفاقی وزیر بنا دیا۔ پولیس نے اس کیس کی ایف آئی آر درج نہیں کی۔ پولیس پر الزام لگایا گیا کہ اس نے ایک صوبائی وزیر کے اثر و رسوخ کی وجہ سے خاموشی اختیار کی، جس کا بھائی مبینہ طور پر ملزمان میں شامل تھا۔ تاہم صوبائی وزیر نے اس الزام کی تردید کی۔ وفاقی حکومت اور بلوچستان کی صوبائی حکومت نے اس واقعے کی تفتیش شروع کی اور پولیس نے سات میں سے چار ملزمان کو گرفتار کر لیا۔ واقعے کے بڑے ملزم اکبر عمرانی کو

(Posted on March 31, 2009)

30 نومبر کو کندھ کوٹ، سندھ سے گرفتار کیا گیا۔ بلوچستان ہائی کورٹ نے کیس کے اندراج کا حکم دیا اور اکتوبر کے وسط تک انکوائری مکمل ہوگئی اور حکام نے باقی ملزمان کو بھی گرفتار کرلیا۔ پارلیمنٹ کی خاتون ممبر، جس نے قومی اسمبلی میں یہ واقعہ اٹھایا تھا، اسے قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔

نومبر 2006 میں موضع عبدو، ضلع شکارپور میں محمد ایوب مہر کی تین بیٹیوں اور بہو صفیہ مہر کو غیر مردوں سے ناجائز تعلقات کے الزام میں قتل کردیا گیا تھا۔ اس کیس کے بارے میں سال کے دوران کوئی پیشرفت نہیں ہوئی۔

قانونی پابندی کے باوجود پنجاب اور سرحد میں خواتین کو تنازعات کے تصفیئے کے لئے بطور معاوضہ مخالف قبیلے کے حوالے کرنے کا سلسلہ جاری رہا، جسے 'ونی' یا 'سوارا' بھی کہا جاتا ہے۔

پارلیمنٹ نے 2007 فروری میں جبری شادیوں پر پابندی لگادی تھی، لیکن اس قانون پر پوری طرح عمل نہیں ہوا۔

عالمی بنک نے فروری 2007 میں ایک رپورٹ جاری کی تھی، جس میں بتایا گیا تھا کہ دیہی علاقوں میں تقریباً ایک تہائی شادیاں وٹہ سٹہ کے تحت ہوتی ہیں۔ اس رسم میں انتقامی کارروائی کا خطرہ موجود رہتا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ جوابی کارروائی کے خطرے کی وجہ سے خواتین کو کچھ تحفظ بھی ملتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق وٹہ سٹہ کی صورت میں طلاق اور گھریلو تشدد کے امکانات خاصے کم ہوتے ہیں۔ پاکستان کے انسانی حقوق کمیشن سمیت انسانی حقوق کی تنظیموں نے اس رسم پر تنقید کی، کیونکہ اس میں عورتوں کو تجارتی مال سمجھ لیا جاتا ہے اور اگر ایک گھر میں جھگڑا ہو تو دوسرے گھر پر بھی اثر پڑتا ہے۔

دیہی سندھ میں جاگیرداروں نے اپنی جائداد تقسیم ہونے سے بچانے کیلئے لڑکیوں کی قرآن سے شادی کرنے کی رسم جاری رکھی۔ جن لڑکیوں کی شادی قرآن سے کی جاتی ہے، ان کی جائداد ان کے والد یا بڑے بھائی کے قبضے میں رہتی ہے اور ان خواتین کو 14 سال سے بڑے کسی مرد سے ملنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ خواتین گھر کے اندر رہتی ہیں اور اپنے خاندان سے باہر کسی سے رابطہ نہیں رکھ سکتیں۔

عصمت فروشی قانوناً ممنوع ہے۔ بیشتر طوائفیں اندرون ملک یا بیرون ملک اسمگل کی جانے والی لڑکیاں ہوتی ہیں، جنھیں ان کی مرضی کے بغیر پیشہ کرانے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ پولیس نے اکثر رشوت لے کر طوائفوں کے دھندے کو نظرانداز کیا۔ سال کے دوران پولیس نے قحبہ خانوں پر چھاپے بھی مارے، لیکن قحبہ خانے خاص طور پر بڑے شہروں میں قحبہ خانے خفیہ طور پر چلتے رہے۔

جنسی طور پر ہراساں کرنے کا مسئلہ وسیع پیمانے پر موجود رہا۔ کام کرنے کی جگہ پر خواتین کی حفاظت کا کوئی قانون نہیں۔ اخباری اطلاعات سے ظاہر ہوا کہ گھروں میں کام کرنے والی نوکرانیوں اور نرسوں کو اس مسئلہ کا سب سے زیادہ سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ ضابطہ تعزیرات میں کسی کو جنسی طور پر تنگ کرنے کی ممانعت ہے، لیکن اس جرم میں بہت کم قانونی کارروائی کی گئی۔

قانون میں جنس کی بنیاد پر امتیاز برتنے پر پابندی ہے۔ لیکن حقیقتاً اس پابندی پر عمل نہیں کیا گیا۔ خواتین سے عائلی قوانین، جائداد کے قوانین اور عدالتی انصاف کے معاملے میں امتیاز برتا جاتا رہا۔

عائلی قوانین خواتین کو طلاق، نان ونفقہ اور بچوں کی تحویل کے معاملے میں تحفظ فراہم کرتے ہیں اور اس کے لئے واضح اصول متعین ہیں، لیکن بہت سی خواتین کو ان قانونی حقوق کا علم ہی نہیں تھا یا وہ وکیل کی مدد حاصل کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھیں۔ بہت سی طلاق یافتہ خواتین ایسی تھیں، جن کا کوئی ذریعہ روزگار نہیں تھا اور ان کے خاندان والوں نے بھی ان سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ قانونی ممانعت کے باوجود دیہی علاقوں میں دلہنوں کی خرید وفروخت کا سلسلہ جاری رہا۔ خواتین کو قانوناً خاندان کی اجازت کے بغیر شادی کرنے کی اجازت ہے، لیکن عملاً اگر کسی خاتون نے پسند کی شادی کی تو خاندان والوں نے اس سے قطع تعلق کرلیا یا غیرت کے نام پر قتل کرڈالا۔

(Posted on March 31, 2009)

قانون وراثت میں خواتین سے امتیاز برتا جاتا ہے۔ بیٹوں کے مقابلے میں بیٹیوں کو جائداد میں آدھا حصہ ملتا ہے۔ بیویوں کو شوہروں کی جائداد میں صرف آٹھواں حصہ ملتا ہے۔ عملاً خواتین سے بہت زیادہ امتیاز برتا گیا اور اکثر انھیں مَردوں کے مقابلے میں کم حصہ دیا گیا۔
ملازمت کے حصول میں خواتین سے بہت زیادہ امتیاز برتا گیا اور اکثر انھیں مَردوں کے مقابلے میں بہت کم معاوضہ دیا گیا۔ بہت سے دیہی علاقوں میں سخت سماجی دباؤ کی وجہ سے خواتین گھروں سے باہر کام نہیں کرسکتیں۔ بعض قبائل میں یہ روایت جاری رہی کہ خواتین کو قریبی رشتہ داروں کے سوا کسی مَرد سے ملنے کی اجازت نہیں۔

خواتین کی بہت سی این جی اوز نے، جن میں پروگریسو ویمن ایسوسی ایشن، سحر، اسٹرگل فار چینج، وار اگینسٹ ریپ اور عورت فاؤنڈیشن شامل ہیں، شہری علاقوں میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ انھوں نے خاص طور پر گھریلو تشدد، حدود آرڈی ننس اور غیرت کے نام پر قتل جیسے مسائل پر توجہ دی۔

بچے

حکومت نے زیرِ نظر سال کے دوران بعض قوانین اور پروگراموں کے ذریعے بچوں کے حقوق اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے کچھ اقدامات کئے۔ تاہم بچوں کے مسائل موجود رہے۔ دہشت گردی اور منشیات کے جرائم میں ملوث بچوں کو کم عمر ملزمان کے انصاف کے نظام کے آرڈی ننس میں کوئی تحفظ حاصل نہیں۔ بچوں کے حقوق کے تحفظ کی سوسائٹی (سپارک) کی رپورٹ کے مطابق 12 سال تک کے بچوں کو انسداد دہشت گردی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا۔ اس قانون کے تحت بچوں کو سزائے موت بھی دی جاسکتی ہے۔

مقامی قوانین میں مفت تعلیم کی گنجائش نہیں اور اسکول عام طور پر فیس وصول کرتے ہیں۔ اگرچہ بعض صوبائی حکومتوں مثلاً حکومت پنجاب نے مفت تعلیم کے قوانین منظور کئے، تاہم بہت سے سرکاری اسکولوں میں تدریس، کتابوں، یونیفارم اور دوسرے تعلیمی مواد کے لئے فیس اور دوسرے اخراجات وصول کئے جاتے رہے۔ بہت سے دیہی علاقوں میں سرکاری اسکول خصوصاً پرائمری سے اوپر کے درجے کے اسکول موجود نہیں تھے، جس کی وجہ سے والدین کو اپنے بچوں کو مدرسوں میں داخل کرانا پڑا۔ شہری علاقوں میں بعض والدین نے سرکاری اسکولوں میں سہولتوں اور معیاری تعلیم کے فقدان کی وجہ سے اپنے بچوں کو پرائیویٹ اسکولوں میں داخل کرایا۔

اگرچہ سرکاری ہسپتالوں میں لڑکیوں اور لڑکوں کے لئے برابر کی سہولتیں ہیں، تاہم اکثر خاندان والوں نے لڑکوں کے علاج پر زیادہ توجہ دی۔

بچوں سے زیادتی کرنے کا مسئلہ بھی وسیع پیمانے پر موجود رہا۔ بچوں کے حقوق کی این جی اوز کے مطابق خاندانوں کے اندر بچوں سے زیادتی کا مسئلہ زیادہ عام رہا۔ این جی اوز کے مطابق نومبر کے آخر تک بچوں سے زیادتی کے 1,417 واقعات ہوئے، جبکہ 2007 میں یہ تعداد 2,650 تھی۔ ان واقعات میں سے 70 فی صد کا تعلق بچیوں سے تھا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق بعض مدارس میں مذہبی انتہا پسندی اور تشدد کی تعلیم دی جاتی رہی۔ اسی طرح صوبہ سرحد اور اندرون سندھ کے بعض دور دراز مقامات پر بچوں کو غیر قانونی حراست میں رکھا گیا، جہاں ان کے رہنے کے حالات بہت خراب تھے اور ان کے ساتھ جسمانی یا جنسی طور پر زیادتی کی گئی۔

لڑکوں کی شادی کی قانونی عمر 18 سال اور لڑکیوں کے لئے 16 سال ہے۔ کم عمری کی شادی پر قانونی پابندی کے باوجود اس طرح کی شادیاں ہوتی رہیں۔ مارچ میں فیملی پلاننگ ایسوسی ایشن آف پاکستان کے اندازے کے مطابق ملک میں کُل شادیوں میں سے 32 فیصد کم عمری کی شادیاں تھیں۔ 2007 میں اسلام آباد میں انسانی حقوق کے بارے میں ایک سیمینار میں شرکا کو بتایا گیا کہ سندھ اور صوبہ سرحد کے بعض علاقوں میں 12 سال کی

(Posted on March 31, 2009)

لڑکی 90,000 سے 200,000 روپے تک (1,143 ڈالر سے لے کر 2,539 ڈالر) میں خریدی جاسکتی ہے۔ دیہی علاقوں میں غریب خاندانوں نے اپنے بچوں کو جبری مشقت کرنے والے مزدوروں کے طور پر بیچا۔ اسی طرح بچیوں کی شادی کے لئے رقم وصول کی۔

30 مئی کو پچ، سندھ میں ایک جرگے نے حکام سنایا کہ چاکرانی قبیلے کی 15 لڑکیاں، جن کی عمریں 3 سے 10 سال تک تھیں، ونی کے طور پر مخالف قبیلے کو دی جائیں تاکہ ان کے درمیان پرانی دشمنی ختم کرائی جاسکے۔ جون تک چاکرانی قبیلے نے یہ بچیاں مخالف قبیلے کے حوالے نہیں کی تھیں، تاہم اس قبیلے کے ساتھ اس کی صلح ہوگئی۔

ایدھی ویلفیئر ٹرسٹ نے بتایا کہ اسے کراچی اور ملک کے دوسرے علاقوں سے ہر مہینے کوڑے کے ڈھیر سے 30 نوزائیدہ بچے اور اس سے چار گنا تعداد میں نوزائیدہ بچوں کی لاشیں ملتی ہیں۔ ٹرسٹ نے یہ بھی بتایا کہ 1970 سے اب تک اسے کوڑے کے ڈھیروں سے 68,000 بچوں کی لاشیں ملی ہیں۔ جن نوزائیدہ بچوں کو اس طرح پھینک دیا جاتا ہے یا ہلاک کیا جاتا ہے، ان میں سے 98 فیصد لڑکیاں ہوتی ہیں۔ ملک بھر میں بے گھر بچوں کی سرکاری سہولتوں تک رسائی کے بارے میں اعداد و شمار دستیاب نہیں البتہ سول سوسائٹی کی بعض تنظیموں نے بچوں کے لئے اس طرح کی سہولتوں کا مطالبہ کیا۔

بچوں کی اسمگلنگ اور ان سے پیشہ کرانے کے مسائل موجود رہے۔ بچوں کے جنسی استحصال کی روک تھام کی غیر سرکاری تنظیم 'ساحل' کے مطابق بچوں سے خود پیشہ کرانے کی بجائے کسی تیسرے فریق کے ذریعے بچوں سے پیشہ کرایا جاتا ہے۔

2007 میں یہ اطلاعات ملی تھیں کہ مذہبی جنگجو زبردستی بچوں کو جنگجوؤں کے طور پر بھرتی کرتے ہیں۔ بی بی سی کی اطلاع کے مطابق طالبان کے حامی جنگجو ٹانک اور دیر میں 11,12 سال کے بچوں کو اغوا کرتے ہیں اور انھیں خودکش حملوں کی تربیت دیتے ہیں۔ مارچ 2007 میں پولیس اور طالبان جنگجوؤں کے درمیان ٹانک میں تصادم ہوا، جہاں لڑکوں کے ایک ہائی اسکول میں حکام نے جنگجوؤں کی مخالفت کی، جو اسکول کے لڑکوں کو بھرتی کرنا چاہتے تھے۔ اخباری اطلاعات کے مطابق جنگجوؤں نے بعد میں اسکول کے پرنسپل کو اغوا کرلیا، کیونکہ اس نے پولیس کو اطلاع کی تھی۔ ٹانک میں ہونے والی جھڑپ میں 25 جنگو اور ایک پیرا ملٹری آفیسر ہلاک ہوا تھا۔

سپارک تنظیم کے مطابق 2007 میں شہری علاقوں میں 100,000 سے زیادہ بچے سڑکوں پر رہ رہے تھے۔ ان میں سے بہت سے ایسے بچے تھے، جو پنجاب اور سندھ کے اندرونی علاقوں سے گھروں سے بھاگے ہوئے تھے یا وہ افغان مہاجر بچے تھے۔

انسانی اسمگلنگ

قانون میں اندرون ملک یا بیرون ملک انسانوں کی اسمگلنگ کی ممانعت ہے، تاہم ایسی اطلاعات ملتی رہیں کہ انسانوں کو اندرون ملک اور بیرون ملک اسمگل کیا جارہا ہے۔

ملک سے بڑی تعداد میں لوگ اسمگل کرکے باہر بھیجے گئے یا باہر سے ملک میں لائے گئے یا لوگوں کی اسمگلنگ کے لئے پاکستان کو گزرگاہ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اندرون ملک لوگوں کی اسمگلنگ ایک سنگین مسئلے کے طور پر موجود رہی، جس کے ذریعے ہزاروں عورتوں اور بچوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا گیا۔ اس کے علاوہ مردوں اور عورتوں کو مشرق وسطیٰ بھی اسمگل کیا گیا، جہاں وہ جبری مشقت کرتے ہیں یا گھریلو غلاموں کی طرح کام کرتے ہیں۔ بنگلہ دیش، ہندوستان، برما، افغانستان، سری لنکا، نیپال اور وسطی ایشیا کے ملکوں سے بھی اسمگل ہونے والی عورتیں اور بچے پاکستان پہنچے۔ ایسی عورتوں

(Posted on March 31, 2009)

اور بچوں کو عصمت فروشی اور جبری مشقت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ بنگلہ دیش، سری لنکا، نیپال اور برما کی عورتوں کو پاکستان کے راستے اسمگل کر کے خلیج کے ملکوں میں بھی پہنچایا جاتا رہا۔

انسانی اسمگلنگ کے جرم پر سات سال سے 14 سال تک قید اور جرمانے کی سزا مقرر ہے۔ ایف آئی اے کا ایک یونٹ انسانی اسمگلنگ روکنے کا ذمہ دار ہے۔ اس کے علاوہ ایک بین الوزارتی کمیٹی بھی اس مقصد کے لئے کام کر رہی ہے۔ حکومت نے انسانی اسمگلنگ کی چھان بین کے لئے دوسرے ملکوں سے بھی تعاون کیا۔

حکام نے زیر نظر سال کے دوران انسانی اسمگلنگ کے تقریباً 1,300 کیس درج کئے۔ ان اعداد و شمار میں غیر قانونی اشیا اسمگل کرنے والے بھی شامل ہیں، کیونکہ ایف آئی اے دونوں قسم کی اسمگلنگ کے درمیان فرق نہیں کرتی۔ سال کے اختتام تک حکام نے تقریباً 5,000 ایسے لوگوں کا پتہ چلایا اور انھیں حراست میں لیا، جو جعلی کاغذات کے ذریعے یا غیر قانونی راستے سے بیرون ملک جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایف آئی اے کے مطابق 7 سے 8 ہزار لوگوں نے اسمگلروں کے گروہوں کے ذریعے جعلی دستاویزات کی بنیاد پر بیرون ملک جانے کی کوشش کی۔

نومبر تک ایف آئی اے نے 183 ایسے ایجنٹوں کو گرفتار کیا، جو لوگوں کو بیرون ملک بھیجنے کا جھانسہ دیتے تھے۔ ایف آئی اے نے ایک 'سرخ کتاب' بھی جاری کی، جس میں ایسے اسمگلنگ ایجنٹوں نے نام اور پتے درج تھے، جنھیں پولیس گرفتار نہیں کر سکی تھی۔ اگرچہ صحافیوں اور حکام کو یہ کتاب دی گئی، لیکن عام لوگوں کو نہیں دی گئی۔

حکومت نے یونیسیف اور یو اے ای کے تعاون سے ان بچوں کو ملک واپس لانے اور انھیں بحال کرنے کے پروگرام پر عمل کیا، جنھیں اونٹوں کی دوڑ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ 2005 میں شروع کئے جانے والے اس پروگرام کے تحت تقریباً 700 بچوں کو وطن واپس لایا گیا۔ ایف آئی اے نے یو اے ای کی طرف سے ملنے والا معاوضہ تقسیم کرنے میں مدد دی۔

ملک کے دیہی علاقوں سے عورتوں اور بچوں کو شہری علاقوں میں لایا گیا اور انھیں عصمت فروشی اور مشقت کرانے کے لئے استعمال کیا گیا۔ اینٹوں کے بھٹوں، چاول کے کارخانوں اور ٹیکسٹائل فیکٹریوں میں بچوں سے جبری مشقت لینے کا سلسلہ جاری رہا۔ ایسے بھی واقعات ہوئے کہ لوگوں نے اپنے بچوں کو جبری مشقت کے لئے بیچ دیا۔ ایسا بھی ہوا کہ شادی یا جائز ملازمت کے بہانے لوگوں سے ان کے کے بچے لئے گئے، جنھیں بیرون ملک اسمگل کر دیا گیا۔ بعض صورتوں میں بچوں کو اغوا کر کے بھی بیرون ملک اسمگل کیا گیا۔ مشرقی ایشیائی ملکوں اور بنگلہ دیش سے اسمگل کی جانے والی عورتوں کو پاکستان کے راستے مشرق وسطیٰ بھیجا گیا۔ اسمگلروں نے ان عورتوں کو اسمگل کرنے کے لئے پولیس اور امیگریشن والوں کو رشوتیں دیں۔ 2007 میں حکام نے ایسے سرکاری افسروں اور ایف آئی اے کے انسپکٹروں کو گرفتار کیا اور ان پر مقدمہ چلایا، جو ان اسمگلروں سے رشوت لے کر ان کی مدد کرتے تھے۔

2005 میں مرکزی حکومت نے اسمگلنگ سے متاثر ہونے والے لوگوں کے لئے اسلام آباد میں ایک ماڈل پناہ گاہ قائم کی۔ حکومت نے اسمگلنگ کا شکار ہونے والے غیر ملکیوں کو بھی عارضی پناہ فراہم کی۔

اسمگلنگ کے غیر ملکی متاثرین خصوصاً بنگلہ دیشی باشندوں کو وطن واپس جانے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسمگل ہونے والی خواتین، جن سے عصمت فروشی کرائی گئی، جب وطن واپس پہنچیں تو ان سے سماجی امتیاز برتا گیا۔

امریکی محکمہ خارجہ کی انسانی اسمگلنگ کے بارے میں سالانہ رپورٹ اس ویب سائیٹ پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے:

(Posted on March 31, 2009)

www.state.gov/g/tip

معذورافراد

قانون میں معذورافراد کو برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ وفاقی اور صوبائی سطح پر ملازمتوں میں معذوروں کا کوٹہ مقرر ہے اور سرکاری اور پرائیویٹ اداروں پر لازم قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی کم از کم دو فیصد ملازمتیں معذورافراد کو دیں، جو اس کی اہلیت رکھتے ہوں۔ لیکن اس قانون پر عملدرآمد کا مناسب انتظام نہیں، جس کی وجہ سے اس پر صرف جزوی طور پر ہی عمل ہوتا ہے۔

حکومت نے سرکاری یا غیر سرکاری دفاتر یا دوسری جگہوں پر معذورافراد کے لئے خصوصی انتظامات کے لئے کوئی قانون نہیں بنایا اور نہ ہی کوئی قاعدہ مقرر کیا۔ ذہنی اور جسمانی معذورافراد زیادہ تر اپنے اہل خانہ کی نگرانی میں رہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض جرائم پیشہ لوگ معذوروں سے بھیک منگواتے ہیں اور بھیک کی زیادہ تر آمدنی خود لے لیتے ہیں۔

جو ادارے معذوروں کو ملازم نہیں رکھنا چاہتے، وہ اس کے بدلے ایک مقررہ رقم ادا کر سکتے ہیں، جو معذوروں کیلئے قائم کردہ فنڈ میں جمع ہو جاتی ہے۔ تاہم اس اصول پر بہت کم عمل کیا گیا۔ معذورافراد کی بحالی کی قومی کونسل نے کچھ معذوروں کو روزگار، قرضے کی سہولت اور گزارہ الاؤنس فراہم کیا۔ کونسل کے زیر اہتمام ''معذوروں کی بحالی کی سوسائٹی'' بھی کام کرتی رہی، جس نے معذورافراد کی بحالی، پیشہ ورانہ تربیت اور کسی حد تک علاج کا انتظام کیا۔

جب کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج نے ایک معذور بچے کا اس بنا پر علاج کرنے سے انکار کیا کہ کالج میں معذورافراد کے لئے سہولیات موجود نہیں تو پنجاب کے وزیراعلیٰ شہباز شریف نے 7 دسمبر کو حکم دیا کہ بچے کو کالج میں داخل کیا جائے اور اس کے علاج کے اخراجات صوبائی حکومت ادا کرے گی۔

ووٹنگ یا دوسرے شہری امور میں حصہ لینے کے سلسلے میں معذورافراد پر کوئی پابندی عائد نہیں۔

نجی سطح پر اس بات کا بڑے پیمانے پر اعتراف کیا جاتا ہے کہ قوم اور نسل کی بنیاد پر منظم طریقے سے امتیاز برتا جاتا ہے، تاہم اس امتیاز اور تعصب کے بارے میں مکمل اور درست اعداد و شمار دستیاب نہیں۔

دیگر سماجی امتیازات اور تعصبات

ہم جنس پرستی ایک فوجداری جرم تصور کیا جاتا ہے۔ تاہم حکومت نے اس جرم پر شاذ و نادر ہی کوئی قانونی کارروائی کی۔ ہم جنس پرست لوگ عموماً اپنی عادت کو چھپا کر رکھتے ہیں۔ زیر نظر سال کے دوران ایسا کوئی کیس سامنے نہیں آیا کہ کسی سے اس کی ہم جنس پرستی کی عادت کی بنا پر امتیاز برتا گیا ہو۔

نیشنل ایڈز کنٹرول پروگرام

نیشنل ایڈز کنٹرول پروگرام کے مطابق سرکاری ملازمتوں میں ایچ آئی وی/ایڈز سے متاثرہ افراد کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا، اگرچہ سماجی سطح پر ایسے افراد کے ساتھ رویے میں بہتری تو آرہی ہے لیکن ان کے ساتھ سماجی امتیاز بہر حال برتا جا رہا ہے۔ NACP کے مطابق اس وقت پاکستان میں تقریباً نوے ہزار افراد ایڈز سے متاثرہ ہو چکے ہیں۔ ان میں سے نصف صوبہ سندھ میں آباد ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ صدیوں پرانے سماجی رویے اور روایات کی وجہ سے خواتین کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اس کے ساتھ ساتھ اقتصادی ناہمواریاں ایچ آئی وی/ایڈز کے پھیلاؤ کی روک تھام کی کوششوں میں رکاوٹ بن رہی ہیں۔ اقوام متحدہ اور دیگر امدادی اداروں کے تعاون سے حکومت نے نیشنل ایڈز کنٹرول پروگرام شروع کیا ہے تاہم عوام کو

(Posted on March 31, 2009)

ایڈز کے بارے میں شعور دیا جائے۔اس پروگرام کے تحت مختلف تقریبات منعقد کر کے اور مساجد کے ذریعے بہبود آبادی اور ایڈز کے بارے میں عوام میں آگاہی فراہم کی جارہی ہے۔

مزدوروں کے حقوق

19 نومبر کو 2002ء انڈسٹریل ریلیشنز آرڈیننس مجریہ 2002ء کو تبدیل کر کے انڈسٹریل ریلیشنز ایکٹ 2008ء متعارف کرایا اور لیبر یونینز قائم کرنے کی اجازت دے دی گئی، مزدوروں کی مختلف تنظیموں کو یہ شکایت ہے کہ اس قانون کی تیاری اور نفاذ میں ان سے مشورہ نہیں کیا گیا۔

انجمن سازی کا حق

آئین میں انجمن سازی کا حق عوام کو دیا گیا ہے۔مزدوروں اور کارکن کسی پیشگی اجازت کے بغیر اپنی پسند سے آزادانہ انجمنوں میں شامل ہو سکتے تھے لیکن عملی اعتبار سے نومبر میں متعارف کرائے جانے والے قانون کے نفاذ کا اطلاق ابھی دیکھنا باقی ہے کیونکہ سابقہ آرڈیننس سال بھر نافذ رہا تھا۔

2002ء کے انڈسٹریل ریلیشنز آرڈیننس میں سکیورٹی کے اداروں، سرکاری ملازمین، توانائی، جہاز رانی، تیل اور گیس کے شعبوں، محکمہ ڈاک ذرائع ابلاغ، مواصلات، ٹیلی کمیونیکیشن، فائر فائٹنگ، تعلیم، صحت کے محکموں اور ذیلی اداروں اور غیر سرکاری تنظیموں کے ملازمین کے ساتھ ساتھ تمام سرکاری وغیر سرکاری اداروں کے انتظامی عہدوں پر فائز افراد کے لیے انجمن سازی کرنے پر پابندی تھی۔حکومت کو کسی بھی شعبے کے کارکنوں کی انجمن سازی کو روکنے، انہیں معطل کرنے ان کی رجسٹریشن منسوخ کرنے اور ان کے عہدوں پر پابندی لگانے کے وسیع اختیارات حاصل تھے۔

اگرچہ نومبر 2008ء کے ایکٹ میں کچھ نجی اور سرکاری اداروں کے ملازمین کو یونین سازی کا حق دیا گیا ہے تاہم اب بھی بہت سے اداروں کے ملازمین کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

انڈسٹریل ریلیشنز ایکٹ میں ٹریڈ یونینز کی رکنیت حاصل کرنے کے حقوق بڑی حد تک محدود طور پر دیے گئے ہیں، اس سے مزدوروں کی چھوٹی تنظیمیں خاص طور پر متاثر ہو رہی ہیں تاہم ٹریڈ یونینز کو اپنی پسند کی فریڈیشن یا کنفیڈریشن میں شامل ہونے کی اجازت دی گئی ہے۔

2002ء کے IRO میں بجلی پیدا کرنے اور ترسیل کے ذمہ دار اداروں سرکاری ائرلائن اور جہاز رانی کے اداروں کے ملازمین کو یونین سازی یا ہڑتال کرنے کا حق نہیں دیا گیا تھا۔اب بھی IRO میں ملازمین کو ہڑتال کرنے کی بہت ہی محدود آزادی ملی ہے۔حکومت کو کوئی بھی ہڑتال ختم کرانے کے لامحدود اختیارات حاصل ہیں۔حکام کسی بھی یونین کے اقدامات کو دہشت گردی پر مبنی قرار دے سکتے ہیں۔بنیادی ضروریات فراہم کرنے والے کسی ادارے میں ہڑتال نہیں کی جاسکتی۔غیر قانونی ہڑتال کرانے کے ذمہ دار رہنماؤں کے لیے کوئی تحفظ نہیں ہے۔IRO کے مطابق آجر قانونی ہڑتال کرانے والے یونین رہنماؤں کے خلاف انتقامی کاروائیاں نہیں کر سکتے ایسا کرنے کی صورت میں انہیں جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔قانون میں سیاسی بنیاد پر کی جانے والی یا کسی بھی ہمدردی میں ہونے والی ہڑتال کی صراحت واضح نہیں ہے۔

نیا قانون بھی کارکنوں کے اختیارات اور حقوق کو محدود کرنے میں تو بہت واضح ہے لیکن اس میں اپنے کسی مطالبے کے حق میں ہڑتال کرنے والے ملازمین اور کارکنوں کے سلسلے میں خاموش ہے۔

لازمی ملازمتوں کا ایکٹ مجریہ 1952ء سرکاری شعبے کے مختلف اداروں کے ملازمین کو سودا کاری کرنے اور ہڑتال وغیرہ کرنے کے اختیارات نہیں دیتا۔لازمی ملازمتوں کے اس قانون کا اطلاق توانائی کی پیداوار، بجلی کی پیداوار اور ترسیل، ائیر لائنز، شپنگ جیسے اداروں پر ہوتا ہے۔اس ایکٹ میں

(Posted on March 31, 2009)

قانونی طور پر صلاح مشورے اور جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے مہلت لازم قرار دی گئی ہے اور اسی طرح سے قومی مفادات کو متاثر کرنے یا عوام کو شدید مشکلات سے دوچار کرنے والی صورتحال سے بچنے کے لیے حکومت کو جو اختیارات دیے گئے ہیں ان کی رو سے ہڑتال کرنے کی آزادی نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہے حکومت کسی بھی ہڑتال کو تیس روز سے زائد گزرنے پر لازمی ملازمتوں کے اس قانون کے تحت ختم کر سکتی ہے۔

غیر سرکاری تنظیموں اور لیبر یونین کے مطابق ملک میں اس سال کل افرادی قوت پانچ کروڑ اسی لاکھ تھی۔ حکومت کا اندازہ ہے کہ اس میں چار فیصد کارکن یونین سازی کے عمل میں شریک ہیں، جبکہ مزدوروں کے رہنماؤں کا کہنا ہے کہ ان کی تعداد کو جان بوجھ کر کم بتایا جاتا ہے۔ غیر رسمی شعبے میں ستر فیصد سے زائد افرادی قوت کام کر رہی ہے ان کی یونین نہیں ہے۔

حکومت کی طرف سے کسی بھی یونین کو باقاعدہ مروجہ طریقہ کار سے ہٹ کر ختم کرنے کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔

کراچی شپ یارڈ اینڈ انجینئرنگ ورکس کی یونین پر سندھ رجسٹرار آف ٹریڈ یونینز کی طرف سے 2006ء میں عائد کی گئی پابندی کے قانونی جواز کو یونین کے نمائندوں نے اگست 2001ء میں سندھ ہائی کورٹ مین چیلنج کیا تھا۔ حکومت اس سال اس مقدمہ سے دستبردار ہوگئی۔

تنظیم سازی اور اجتماعی سوداکاری کا حق

بعض شعبوں میں مزدوروں اور ملازمین کی اجتماعی سوداکاری کو قانونی تحفظ حاصل ہے تاہم عملی اعتبار سے نومبر میں متعارف کرائے جانے والے قانون کے اطلاق کو دیکھنا ابھی باقی ہے۔

2002ء کے ایکٹ سے جن شعبوں میں کام کرنے والے ملازمین کو مستثنیٰ رکھا گیا تھا ان کی تفصیل اوپر آچکی ہے۔ 2002ء کے ایکٹ کے دائرہ کار سے باہر کے اداروں میں مسلح افواج، پاکستان سیکورٹی پرنٹنگ کارپوریشن، فائر سروسز اور تیل کی تنصیبات شامل ہیں۔ آجروں کو یونین سازی اور یونین کی سرگرمیون کے خلاف اقدامات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اکثر بیشتر اجتماعی سوداکاری کے حق پر قدغن لگانے یا ہڑتال کی روک تھام کے لیے لازمی ملازمتوں کے قانون کا سہارا لیا جاتا ہے۔

حکومت نے معیشت کے دیگر شعبوں میں (ایکسپورٹ پراسسنگ زونز کے سوا) کسی رکاوٹ کے بغیر یونینز کو اپنی سرگرمیاں جاری رکھنے کی اجازت دے دی ہے۔ لازمی ملازمتوں کے قوانین کے تحت ملک کے بارہ ایکسپورٹ پراسسنگ زونز میں کام کرنے والے پندرہ ہزار سے زائد مزدوروں کو ہڑتال کرنے، یونین سازی کرنے یا اجتماعی سوداکاری کرنے سے محروم کر رکھا ہے۔ ای۔ پی۔ زیڈ اتھارٹی کو اپنے ملازمین کے لیے لیبر لاز تیار کرنے کا اختیار ہے لیکن ابھی اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی ہے۔

2002ء کے آرڈیننس کے مطابق حکومت ہر چھ ماہ بعد جائزہ لیتی تھی کہ آیا اجتماعی سوداکاری کی اجازت دی جائے یا نہیں جن شعبوں میں اجتماعی سوداکاری پر پابندی تھی ان میں معاوضوں کا تعین سہ فریقی صوبائی ویج بورڈ کرتے ہیں عام طور پر یونینز ان بورڈز کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہوتیں۔ تنازعات کا فیصلہ نیشنل انڈسٹریل ریلیشنز کمیشن NIRC کرتا ہے۔ سرکاری شعبے کے ملازمین NIRC میں اپیل نہیں کر سکتے ہیں۔

انٹرنیشنل ٹریڈ یونین کنفیڈریشن (ITUC) کا کہنا ہے کہ اکثر آجر اپنے ملازمین کو یونین کی رکنیت سے محروم کرنے کے لیے انہیں برائے نام انتظامی عہدے پر ترقی دے دیتے ہیں۔ انتظامیہ یونین کی سرگرمیون کو روکنے کے لیے ڈرانے دھمکانے نوکری سے نکالنے اور بلیک لسٹ جیسے حربے استعمال کرتی ہے۔ مثال کے طور پر ستمبر میں یونی لیور نے رحیم یار خان میں اپنی فیکٹری کے دو سو بانوے میں سے دو سو ستاسی عارضی ملازمین کو اس وقت

(Posted on March 31, 2009)

برطرف کردیا جب یونین نے اعلان کیا کہ وہ ان ملازمین کو مستقل کرنے کی کوششوں میں مدد دے گی۔

ITUC نے مارچ میں بتایا کہ بھٹہ خشت کے جبری مشقت کے شکار مزدوروں نے صوبہ پنجاب کے سات اضلاع میں منظّم ہونے کی کوشش کی۔ان مزدوروں کا سب سے بڑا اجتماع لاہور میں ہوا جس میں پانچ ہزار افراد نے شرکت کی۔پاکستان بھٹہ ورکرز یونین نے ایک جلوس نکالنے کی اجازت چاہی تو حکام نے انکار کردیا۔

جبری مشقت یا بیگار پر پابندی

قانون میں غلامی اور ہر طرح کی جبری مشقت بشمول چائلڈ لیبر پر پابندی ہے لیکن عملی طور پر حکومت اس قانون پر پوری طرح عمل نہیں کرا رہی اسی لیے ملک میں جبری مشقت اور چائلڈ لیبر جیسے مسائل موجود ہیں۔

تمام قسم کی جبری مشقت غیر قانونی ہے اس طرح کے قرضہ جات منسوخ کیے جا چکے ہیں۔ایسے قرضہ جات کی وصولی کے لیے عدالت سے رجوع بھی نہیں کیا جا سکتا۔

جبری مشقت کے خاتمے کے قانون مجریہ 1992ء کے اطلاق کے لیے وفاقی سطح پر وزارت افرادی قوت ومحنت جبکہ صوبوں کے محکمہ محنت کے حکام ذمہ دار ہیں۔HRCP کے مطابق اس قانون کا اطلاق نظر ثانی کا محتاج ہے۔قومی کمیشن برائے انسداد جبری مشقت و بحالی آزاد جبری مزدور NCABLRFBL انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن (ILO) کے تعاون سے اس کمیشن کی قومی پالیسی اور لائحہ عمل کو نافذ کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔

SPARC اور SHARP جیسی این جی اوز نے بتایا ہے کہ اس وقت تقریباً بیس لاکھ افراد سے جبری مشقت لی جا رہی ہے ان میں سے زیادہ تر صوبہ سندھ میں کام کر رہے ہیں۔اینٹوں کے بھٹے، شیشہ سازی، قالین بافی اور ماہی گیری جیسی صنعتوں اور شعبوں میں جبری مشقت عام ہے۔ دیہی علاقوں خاص طور پر صوبہ سندھ کے ضلع تھر پارکر میں زراعت اور تعمیرات کے شعبوں میں جبری مشقت کا دور دورہ ہے۔

جنوری میں فریڈم ہاؤس کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ بعض اوقات جبری مشقت کے شکار لوگ غلامی کی زندگی سے بچنے کے لیے اپنے اعضاء خاص طور پر گردے فروخت کر دیتے ہیں۔اقوام متحدہ کے (Integrated Regional Information Networks) (IRIN) نے سندھ انسٹیٹیوٹ آف یورالوجی اینڈ ٹرانسپلانٹیشن کی طرف سے پنجاب میں کئے گئے ایک سروے کی جولائی 2007ء میں شائع ہونے والی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ اپنے گردے بیچنے والے 93 فیصد افراد کو اپنے قرض ادا کرنے کے لیے رقم درکار تھی اور ان میں سے 69 فیصد لوگ جبری مشقت میں پھنسے ہوئے تھے۔ستمبر 2007ء میں حکومت نے انسانی اعضاء کی فروخت کی روک تھام کے لیے ایک آرڈیننس جاری کیا لیکن اس کے باوجود گردے فروخت کرنے کے واقعات اب بھی ہو رہے ہیں۔

جبری مشقت کے شکار افراد کی اکثریت نچلی ذات کے ہندوؤں اور انہی میں سے مذہب تبدیل کر کے مسلمان یا عیسائی ہو جانے والوں پر مشتمل ہے۔

جبری مشقت میں گرفتار لوگوں کی اکثریت کو یہ معلوم نہیں ہو پاتا کہ اس قرض سے ان کی جان کب چھوٹے گی۔بھاگ جانے والے افراد کو اپنے سابقہ مالکان کے انتقام کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔بعض افراد آزاد کر دیئے جانے کے باوجود متبادل روزگار نہ ملنے کے باعث دوبارہ جبری مشقت کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔اگرچہ پولیس اس قانون کی پابندی نہ کرنے والوں کو گرفتار کرتی ہے لیکن ان میں سے اکثر لوگ رشوت دے کر جان چھڑا لیتے

(Posted on March 31, 2009)

ہیں۔انسانی حقوق کے گروپوں کا کہنا ہے کہ سندھ کے دیہی علاقوں میں جاگیرداروں نے کم وبیش 50 نجی جیلوں میں ساڑھے چار ہزار افراد کو جبری مشقت کے لئے قید کر رکھا ہے۔ان جاگیرداروں اور بااثر سیاست دانوں کے درمیان گٹھ جوڑ کی وجہ سے اس مسئلے پر قابو پانا مشکل ہو رہا ہے۔

15 جولائی کو ضلع سانگھڑ کے گاؤں دیم (Dim) میں ایک سندھی جاگیردار علی غلام مری کے چنگل سے 58 جبری مزدوروں کو رہا کرایا گیا۔ان میں مردوں کے علاوہ عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ان میں سے کچھ افراد پچھلے تیس سال سے اپنے قرض چکانے کے لیے جبری مشقت کرنے پر مجبور تھے۔پولیس نے مقدمہ تو درج کیا لیکن کسی کو گرفتار نہیں کیا بلکہ اس جاگیردار کو ان مزدوروں کے لیڈر کے ساتھ گفت وشنید کر کے ایسی تحریری ضمانت حاصل کرنے کا موقع دیا جس کی رو سے مزدوروں کو اپنے قرض ادا کرنے اسی جاگیردار کے پاس کام کرنا لازم ٹھہرا،ایک ہفتے بعد اسی ضلع سے ایک اور جاگیر دار حاجی حسین کیریو کی قید سے 21 مزدوروں کو چھڑایا گیا۔

جنوری 2007ء میں لاہور ہائی کورٹ کے راولپنڈی بنچ نے عورتوں اور بچوں سمیت 21 جبری مزدوروں کو رہا کرایا ان تمام افراد کو اینٹوں کے بھٹے پر مزدوری کرنے کے لیے ایک بیگار کیمپ میں رکھا گیا تھا۔پولیس نے بھٹہ خشت کے مالک ملک یعقوب کے خلاف مقدمہ درج کیا لیکن وہ فرار ہو گیا پورا سال گزرنے کے باوجود اس مقدمے میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔فروری 2007ء میں راولپنڈی کے قریب لوھی بھیر میں واقع اینٹوں کے ایک بھٹے سے 40 مزدوروں کو بھی لاہور ہائی کورٹ کے راولپنڈی بنچ نے رہا کرایا لیکن اس کے بعد اس مقدمے میں پورا سال مزید کوئی کارروائی دیکھنے میں نہیں آئی۔

چائلڈ لیبر پر پابندی اور ملازمت کے لیے کم سے کم عمر کا تعین

قانون میں بچوں سے مزدوری لینا جرم ہے لیکن اس قانون پر عمل درامد کرنے کی پروا نہیں کی جاتی اس وجہ سے بچوں سے مشقت لینے کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کر چکا ہے۔

قانون میں بچوں سے جبری مشقت لینے کی سزا پانچ سال قید اور پچاس ہزار روپے جرمانہ تک ہے۔چودہ برس سے کم عمر بچوں کو کسی کارخانے، ریلوے اسٹیشن، بندرگاہ، کان کنی، آگ بجھانے کے کام اور دیگر نقصان دہ کاموں میں نہیں لگایا جا سکتا۔سڑکیں تعمیر کرنے، آلات جراحی تیار کرنے، گہرے سمندر میں ماہی گیری کرنے، چمڑے کی صنعت، بھٹہ خشت، فٹبال کی تیاری اور قالین بافی سمیت چار پیشوں اور چونتیس اشیاء کے کارخانوں میں بچوں کو بھرتی کرنے پر پابندی عائد کر رکھی ہے۔

قانون کے مطابق بچوں سے سات گھنٹے سے زائد کام نہیں کرایا جا سکتا۔اس دورانیے میں بھی تین گھنٹے کام کے بعد ایک گھنٹے کا وقفہ دینا ضروری ہے اس کے علاوہ بچوں سے رات کے وقت کام لینے اور اوور ٹائم کرانے پر بھی پابندی ہے۔بچوں کو ہفتہ وار ایک چھٹی دینا ضروری ہے۔بچوں کو کام دینے والے آجر کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کے لیے ایک رجسٹر میں اندراج کرے تاکہ محکمہ محنت اسے جانچ سکے۔اپنے خاندانی کام کرنے والوں اور سرکاری سکولوں میں پڑھنے اور کام کرنے والوں پر ان پابندیوں کا اطلاق نہیں ہوتا۔قانون میں اٹھارہ سال سے کم عمر بچوں کے جنسی اور ہر طرح کے استحصال پر پابندی ہے۔انہیں تشدد کا نشانہ بنانے اور انھیں کھیلوں میں بری طرح سے استعمال کرنے کی بھی ممانعت ہے اگر والدین بچوں پر ظلم و جبر کریں تو انھیں بھی قانون کے کٹہرے میں لایا جا سکتا ہے۔

اس قانون کا اطلاق ایک سنگین مسئلہ ہے۔HRCP اور SPARC کے مطابق ایک کروڑ سے ایک کروڑ پندرہ لاکھ کے درمیان بچے مزدوری کرتے ہیں۔ان میں سے زیادہ تر زراعت میں اور گھریلوں ملازمین کے طور پر کام کرتے ہیں۔ذرائع ابلاغ کے مطابق زرعی شعبے سے باہر کام

(Posted on March 31, 2009)

کرنے والے بچوں میں سے ستر فیصد چھوٹی چھوٹی ورکشاپوں میں مزدوری کرتے ہیں چونکہ قانون میں دس افراد سے کم افرادی قوت رکھنے والے کاروبار اور ورکشاپوں میں لیبر قوانین کے اطلاق کی جانچ پڑتال نہیں کر سکتے اس لیے عملی اعتبار سے اس قانوں کی خلاف ورزی پر کوئی کارروائی کرنا مشکل ہے۔وزارت محنت وافرادی قوت کے پاس ہر چھوٹے بڑے کارخانے اور ورکشاپ میں چائلڈ لیبر قوانین کی خلاف ورزی کی جانچ پڑتال کر سکنے والے لیبر انسپکٹروں کا ایک خصوصی گروپ موجود ہے۔حکام کا کہنا ہے کہ اگر چہ ان قوانین کی خلاف ورزی پر فوری کارروائی کی جاتی ہے تاہم وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ مسئلہ اس قدر سنگین ہے کہ ان کی کوششیں ناکافی ثابت ہو رہی ہیں۔لیبر انسپکٹروں میں وسائل کی کمی، تربیت کے فقدان اور بدعنوانی کا رجحان بھی چائلڈ لیبر قوانین پر کما حقہ عمل درامد کی راہ میں ایک بڑی روکاوٹ ہیں، حکام نے این جی اوز کو کسی مداخلت کے بغیر ہر جگہ جانچ پڑتال کرنے کی اجازت دے رکھی ہے اور عام طور پر انھیں بھرپور تعاون بھی فراہم کیا جاتا ہے۔

چائلڈ لیبر قوانین کی خلاف ورزی پر 20 ہزار روپے تک جرمانے کی سزا دی جاسکتی ہے اس قانون کی خلاف ورزی پر پورے سال کے دوران میں کوئی خاص جرمانے عائد نہیں کیے گئے اور ویسے بھی جرمانے کی رقم اس قدر کم ہے کہ لوگ دھڑلے سے اس قانون کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔اگر چہ قانون نافذ کرنے والے اداروں نے چائلڈ لیبر قوانین کی خلاف ورزی کرنے کے سینکڑوں مقدمات دائر کیے اور ان پر فیصلے بھی کئے گئے لیکن عدالتوں نے جو جرمانے کی سزائیں سنائیں وہ شرمناک حد تک کم تھے۔صوبہ سرحد میں اوسطاً تین سو چونسٹھ روپے جرمانہ کیا گیا جبکہ صوبہ بلوچستان میں چائلڈ لیبر کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اوسطاً 7344 روپے جرمانہ ادا کرنا پڑا۔

بے شمار بچے اپنے والدین کے قرضے چکانے کے لیے اینٹوں کے بھٹوں، قالین بافی کے کارخانوں اور کھیتوں میں مزدوری کرنے پر مجبور ہیں۔

کام کاج کرنے کی قابل قبول شرائط

مارچ میں حکومت نے کم از کم ماہانہ اجرت کی شرح چار ہزار روپے سے بڑھا کر چھ ہزار روپے کر دی، اس کا اطلاق صرف صنعتوں اور ایسے کاروباری اداروں پر کیا گیا ہے جہاں پچاس یا زائد افراد ملازم ہوں، کم از کم اجرت کے حوالے سے پاکستان ورکرز فیڈریشن کا مطالبہ تھا کہ اسے بارہ ہزار ماہانہ کیا جائے۔مہنگائی اس قدر ہے کہ حکومت کی طرف سے اعلان کردہ چھ ہزار روپے ماہانہ میں ایک خاندان مناسب انداز میں اپنے اخراجات پورے نہیں کر سکتا۔حکومت کی طرف سے مقرر کردہ کم از کم ماہانہ اجرت کا اطلاق غیر رسمی شعبوں میں کام کرنے والے ملازمین پر نہیں ہوتا، ان میں گھریلو ملازمین اور نقل مکانی کر کے دوسرے شہروں میں مزدوری کرنے والے محنت کش شامل ہیں اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔وفاقی قانون کے مطابق ایک ہفتے میں اوقات کار زیادہ سے زیادہ اڑتالیس گھنٹے تک ہو سکتے ہیں۔سیزنل کارخانوں میں یہ دورانیہ چھپن گھنٹوں تک بڑھ سکتا ہے۔علاوہ ازیں کام کے دوران میں آرام کا وقفہ اور ہر سال باتنخواہ چھٹی بھی ان کا حق ہے۔ان پابندیوں کا اطلاق زرعی مزدوروں، گھریلو ملازمین، ٹھیکے پر کام کرنے والوں اور دس افراد سے کم افرادی قوت والے کارخانوں پر نہیں ہوتا۔

وفاقی لیبر قوانین کے تحت مزدوروں اور ملازمین کو ملنے والی دیگر مراعات میں سرکاری تعطیلات پر چھٹی، اوور ٹائم، بیماری کی صورت میں رخصت، سالانہ چھٹیاں، بچوں کی تعلیم، علاج معالجہ، سوشل سیکورٹی ورکرز ویلفیئر فنڈ اور بڑھاپے کی عمر میں پہنچنے پر ملنے والے مالی فوائد شامل ہیں۔

ITUC کے مطابق حکومت نے 2007ء میں ان قوانین میں اپنی مرضی سے تبدیلی کرتے ہوئے اوقات کار میں اضافہ کر دیا ہے۔مزدوروں اور ملازمین کے تحفظ میں کمی کی ہے اور کانٹریکٹ ملازمین کو اوور ٹائم سے محروم کر دیا گیا ہے۔فوجداری قوانین کے تحت یونین کی سرگرمیوں اور چار سے زائد افراد کے اجتماع کے لیے پولیس سے اجازت لینا لازم ہے۔

(Posted on March 31, 2009)

مزدوروں کے لیے صحت عامہ اور حادثات کی صورت میں تحفظ کی سہولیات ناگفتہ بہ ہیں۔ خاص طور پر کان کنی کے شعبے میں انسانی جان کے تحفظ اور سلامتی کو یقینی بنانے کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ مثال کے طور پر کانوں میں تازہ ہوا آنے اور جانے کا ایک ہی راستہ ہوتا ہے اور کان کنی کے مزدور اپنے روزگار کو خطرے میں ڈالے بغیر اپنے حالات کار کو بہتر بنانے کے لیے آواز نہیں اٹھا سکتے۔

تمام لیبر قوانین پر عمل درامد کی بنیاد ذمہ داری صوبائی حکومتوں پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن وسائل کی کمی بدعنوانی اور نفاذ کے بنیادی ڈھانچے کے نقائص کے باعث ان قوانین کو پوری طرح روبہ کار نہیں لایا جا سکتا۔ ITUC کے مطابق صوبہ سندھ اور صوبہ پنجاب میں کئی آجروں کو لیبر انسپکٹروں نے جانچ پڑتال سے مستثنیٰ کر رکھا ہے۔ بے شمار ملازمین اور مزدور اپنے حقوق سے آگاہ نہیں ہیں۔